خط کی کہانی

خط کی کہانی

غلام حیدر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔110025

پہلی اشاعت	:	1974
تیسری طباعت	:	2010
تعداد	:	1100
قیمت	:	-/13 روپے
سلسلۂ مطبوعات	:	718

Khat ki Kahani

by

Ghulam Haider

ISBN :978-81-7587-427-5

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066 فون نمبر: 26109746 فیکس: 26108159

ای-میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: جے. کے. آفسیٹ پرنٹرس، بازار مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی-110006

اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ایک قومی مقتدرہ کی حیثیت سے کام کررہی ہے جس کا بنیادی مقصد اردو کی ترویج واشاعت کے لیے منصوبے بنانا اوران کوعملی جامہ پہنانا ہے۔ یہ مرکزی حکومت کا سب سے بڑا ادارہ ہے جواردو کے فروغ کے لیے قائم کیا گیا۔اس نے اردو زبان اور ادب کے تحفظ اوراس کی ترویج واشاعت کے لیے مختلف سمتوں میں کام کیا ہے۔قومی اردو کونسل نے اپنے منصوبوں میں کتابوں کی اشاعت کو خاص اہمیت دی ہے کیونکہ کتابیں علم کا سرچشمہ ہیں اور بغیر علم کے انسانی تہذیب کے ارتقا کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔قومی کونسل مختلف جدید اور مشرقی علوم پر مشتمل کتابیں شائع کرتی ہے جن کا مقصد سماجی ترقی، معاشی حصول،عصری تعلیمی اور ثقافتی ضرورتوں کی تکمیل ہے۔اس ضمن میں قومی اردو کونسل ایک طرف تو کلاسیکی ادب کی بازیافت کے لیے اردو کے ادبی شہ پاروں کوشائع کرتی ہے تو دوسری طرف مختلف سماجی علوم وفنون کی اہم کتابوں کوبھی اردو کے قالب میں ڈھالنے کے لیے کوشاں رہی ہے تاکہ ہماری ثقافتی نیز نصابی ضرورتیں

پوری ہو سکیں۔ اسی سلسلے میں قومی کونسل کی خاص توجہ بچوں کے ادب پر بھی رہی ہے تاکہ ہمارے بچے اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کر سکیں اور ہماری ادبی، ثقافتی نیز سائنسی فتوحات سے واقفیت حاصل کر سکیں۔ 'خط کی کہانی' بھی ایسی ہی ایک کتاب ہے جس میں سادہ وسلیس زبان میں خط کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ خط کی ترسیل کا نظام کن دشوار گزار راستوں سے گزر کر یہاں تک پہنچا ہے کہ ہم گھر بیٹھے بیٹھے خط کے ذریعے دور دراز کی خبریں حاصل کر لیتے ہیں۔

قومی کونسل اس کتاب کو بھی اس یقین کے ساتھ پیش کر رہی ہے کہ یہ کتاب بچوں کی ذہنی نشوونما میں اہم کردار ادا کرے گی۔ قارئین سے گزارش ہے کہ اگر اس کتاب میں انہیں کوئی کوتاہی نظر آئے تو قومی اردو کونسل کو آگاہ کریں تاکہ اگلی اشاعت میں اس کا ازالہ کیا جاسکے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

ڈائرکٹر

فہرست



خط کی کہانی

کیا تم نے کبھی کسی کے خط کا انتظار کیا ہے؟ اپنے ابا امی یا کسی دوست کے خط کا — ! بلکہ شاید اِس سے بھی زیادہ سخت انتظار تو اس خط کا ہوتا ہوگا جس میں تمھارے امتحان کا نتیجہ آنے والا ہو۔ آنکھیں دروازے سے لگی ہیں۔ دروازے کا ہر کھٹکا، گلی کی ہر آہٹ بس ڈاکیے کی ہی آواز لگتی ہے اور آج نہیں تو کل خط آجاتا ہے۔ مگر انتظار کا یہ ایک دن بھی پہاڑ ہو جاتا ہے لیکن ذرا اپنے پر دادا کے متعلق سوچو، جنھیں تم نے تو نہیں دیکھا مگر میں نے دیکھا ہے۔ میں کون ہوں؟ یہی خط، لفافہ، اِن لینڈ لیٹر اور نہ معلوم کیا کیا کچھ۔ یہ میرے بہت سے ناموں میں سے کچھ ہیں۔

تمھارے پر دادا گاؤں کے پڑھے لکھے آدمی تھے۔ ہفتے میں کسی مقررہ دِن صبح سویرے وہ اور گاؤں کے کچھ اور لوگ کچی سڑک کے کنارے، آم کے پیڑ کے نیچے کھڑے ہیں۔ آج ڈاکیے کے آنے کا دن ہے نا! کسی کو اپنے پیارے بھائی کے خط کا انتظار ہے، کوئی ماں اپنے بیٹے کے خط کی راہ تک رہی ہے۔ کتنے دن ہوئے اُسے نوکری پر گئے، ابھی تک خط نہیں بھیجا۔ لو وہ دور سے سڑک پر ایک سایہ نظر آیا، لوگوں کی امیدیں بندھ گئیں۔ کون ہو سکتا ہے۔ اِس چلچلاتی دھوپ میں آنے والا، ڈاکیے کے علاوہ! وہی موٹے موٹے جوتے، گھٹنوں سے اوپر گھٹنوں تک خاکی پٹی کسی ہوئی، خاکی وردی، بڑا سا صافہ، چمڑے کا بڑا سا تھیلا کندھے پر جھولتا ہوا اور ہاتھ میں موٹا سا لٹھ۔ ہاں آج سے

اسّی نوّے سال پہلے کا ڈاکیا یہی ہے۔ خط لاتا بھی ہے اور لوگوں کے خط لے بھی جاتا ہے۔ کچھ لوگ خوش ہیں، اُن کے پیاروں کے خط آئے ہیں۔ کچھ اُداس ہیں۔ خط نہیں آیا۔ اب پورے سات دن اور انتظار کرنا پڑے گا۔

ڈاکیا بیٹھ گیا۔ کچھ لوگوں نے خط خریدے، ڈاکیے سے قلم دوات مانگی اور گاؤں کے کسی پڑھے لکھے آدمی سے وہیں جواب لکھوانے لگے۔ ڈاکیے کو جانے کی جلدی ہے، چونکہ اُسے ابھی کئی گاؤں اور بھی جانا ہے اور پھر شام تک شہر کے ڈاک خانے بھی پہنچنا ہے۔

اور میں نے تو تمھارے پرداداکے پر دادا کو بھی دیکھا ہے۔ گاؤں کے کچھ لوگوں کے ساتھ چوپال پر بیٹھے ہیں۔ دُور سے ایک عجیب سی شکل کا آدمی آتا دکھائی دیا۔ "ارے آج ہرکارا کیوں آرہا ہے۔ خیر تو ہے!؟" بچّے شور مچا رہے ہیں۔ "ہرکارا، ہرکارا" لو وہ آگیا۔ چمک دار بلم جس میں گھنگرو بندھے ہیں۔ سر پر بہت موٹا سا پگڑ، کمر میں کپڑے کی بہت چوڑی سی پیٹی جس میں دونوں طرف گھنٹیاں بھی بندھی ہوئی ہیں جو اس کے چلنے کے ساتھ ساتھ بجتی بھی رہتی ہیں، گاؤں کے کتّے اس کے پیچھے بھونک رہے ہیں اور وہ بچّوں اور کتّوں سے بے خبر چلا آرہا ہے۔ آج تم اسے دیکھو تو ضرور پاگل کہو گے۔ خیر جو چاہو کہو، مگر میں جانتا ہوں کہ یہی وہ شخص تھا جس نے صدیوں تک تمھارے بزرگوں کی خدمت کی ہے۔ یہ تھا ہرکارا۔ اُس نے اپنی پیٹی کھولی اور پگڑی اتاری "ارے یہ کیا؟ دونوں میں خط رکھے ہیں!" ہاں بھائی! اسے بڑی مصیبتیں جھیلنی ہوتی ہیں جنگلوں میں جانوروں اور سانپوں سے لڑنا ہوتا ہے، دریا میں تیرنا ہوتا ہے۔ مگر یہ چلتا رہتا ہے، آگے بڑھتا رہتا ہے، اور ہر گاؤں کا اِکّا دُکّا خط جو کبھی مہینے دو مہینے میں آجاتا ہے، یہ اُسے پہنچا دیتا ہے۔ مگر یہ کیا؟ اُس نے خط دینے سے پہلے اُسے خوب غور سے دیکھا اور پھر پیسے کیسے مانگے؟ نہیں یہ انعام نہیں ہے ۔ یہ پیسے تو میری قیمت ہیں جو آج تم ڈاک خانے کی کھڑکی پر دیتے ہو۔ ہاں اُس

زمانے میں خط پانے والا ہی رہا کرتا تھا۔ لوگ اُس سے آس پاس کے گاؤوں اور شہر کی خبریں بھی پوچھ رہے ہیں۔

اور پھر تمھارے پر دادا کے پر دلوا کے پر دادا بلکہ اُن سے بھی پہلے۔ ان کے پاس کبھی کوئی خط نہیں آیا۔ نہ انھوں نے کبھی کسی کو کوئی خط لکھا۔ اصل میں وہ پڑھنا لکھنا بھی نہیں جانتے تھے اور ہرکارا بھی نہیں آتا تھا۔ لیکن ایک بات ضرور تھی۔ دو گاؤں بعد سڑک کے کنارے ایک کوٹھری بنی ہوئی تھی۔ جس میں بادشاہ کے کچھ آدمی بیٹھے رہتے تھے۔ ایک چھپر کے نیچے بہت اچھے سے چار گھوڑے بندھے ہوتے تھے۔ دن میں کسی وقت زور سے ایک نفیری کی آواز آتی اور پھر ایک گھوڑسوار تیزی سے آتا، نفیری کی آواز سنتے ہی ایک آدمی فوراً گھوڑے پر سوار ہو جاتا۔ آنے والے گھوڑسوار نے ایک تھیلا اور سینگ کی بنی نفیری نئے گھوڑسوار کو تھمائی اور نیا گھوڑسوار اتنی ہی تیزی سے آگے بڑھ گیا——

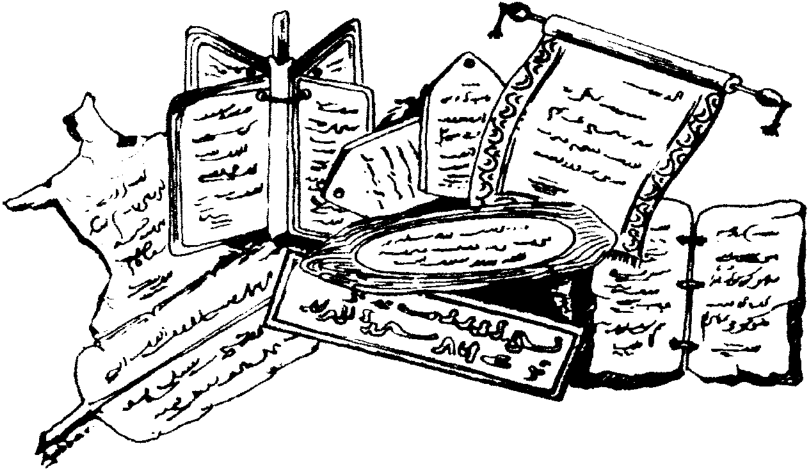
لوگ کہتے ہیں وہ بادشاہ کے خط لے جاتا ہے۔ ایسی ہی بات ہر روز دوسری بار بھی ہوتی ہے، مگر اِس بار گھوڑسوار دوسری طرف سے آتا ہے۔ نہ معلوم بادشاہ اتنے خط کیسے لکھتا ہے؟ مگر بادشاہ کی بات ہے، ہمیں کیا۔!

ہاں، تم نے یہ منظر نہیں دیکھے۔ تم نے سانپوں سے بچنے کے لیے ہرکارے کو اونچے اونچے بانسوں پر نٹوں کی طرح چلتے نہیں دیکھا، تم نے گھوڑسوار نہیں دیکھے تم ابھی کیا جانو کہ انسان نے مجھے حاصل کرنے۔ یعنی اپنا خط ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجنے کے لیے کیا کیا جتن نہیں کیے۔ کن کن چیزوں کو استعمال کیا، کبھی آدمی خود خط لے کر گیا تو کبھی گھوڑے پر چڑھ کر راستہ طے کیا۔ ایک وقت وہ بھی تھا کہ آج کے ہوائی جہاز سے پہلے بھی انسان نے کبوتروں کے ذریعے مجھے ہوائی سواری کھلائی۔

تم تو بس اتنا جانتے ہو کہ دن میں دو یا تین بار پوسٹ مین نے کھٹکا کیا اور تمھارے یا تمھارے آبا جان کے خط دے گیا۔ مگر میں نے دیکھا ہے۔ ماں اپنے بیٹے کے

خط کا انتظار کر رہی ہے۔ خط آبھی گیا ہے، مگر خط لینے کے لیے اس کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ اگر میرے زبان ہوتی تو شاید میں اپنے اوپر لکھے ہوئے ایک ایک لفظ کو زور زور سے بول دیتا ــــ مگر مجھے تو ڈاکیے کے پاس چھپا دیا گیا ہے۔ جب تک اُسے پیسے نہیں ملیں گے میں بیٹے کی خبر ماں کو نہیں دے سکتا ــــ میں نے وہ منظر بھی دیکھا ہے کہ باپ نے اپنی پیاری بیٹی کا خط لینے، بلکہ یہ پہچان لینے سے بھی انکار کر دیا ہے کہ یہ اس کی بیٹی کا خط ہے۔ اگر وہ یہ خط لے لیتا تو اپنے بچّوں کو کھانا کیسے کھلاتا۔

پیغام سے خط تک



میرا سفر

آج تمھیں موٹروں، ریلوں اور ہوائی جہازوں کے لائے ہوئے خط بڑی آسانی سے مل جاتے ہیں اس لیے تم نے کبھی یہ سوچا ہی نہ ہوگا کہ تم تک پہنچنے کے لیے میں نے اور تمھارے بزرگوں نے کیسے کیسے پاپڑ بیلے ہیں، کیا کیا مصیبتیں اٹھائی ہیں۔ اچھا آؤ، اگر تمھیں اچھا لگے تو چلو میرے ساتھ، میں تمھیں دکھاؤں کہ میرا سفر کیا تھا، میں کہاں سے گذرا کس کس نے میری مدد کی اور کس نے میرے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کیں ــــ مگر یہ میرا سفر نہیں ہے، اصل میں تو یہ خود تمھاری یا انسان کی محنت، اس کے شوق اور اُس لگن کی کہانی ہے کہ وہ دور بیٹھے اپنے دوستوں، ساتھیوں اور عزیزوں کا حال معلوم کرلے۔ اگر خود تم میں ہی یہ لگن نہ ہوتی تو میں ہی کیا دنیا کی کوئی بھی آسانی تم تک نہ پہنچ پاتی اور تم غاروں اور جنگلوں میں زندگی گذار رہے ہوتے۔ خیر چھوڑو اسے۔

ہاں! تو میرا اصلی کام ہے سفر کرنا اور جلدی سے جلدی اُس شخص کے پاس پہنچ جانا جس کے پاس مجھے بھیجا گیا ہے۔ بس ہم چلتے ہیں۔ اِس سفر میں تم ایک جگہ سے دوسری جگہ تو جاؤگے ہی مگر ساتھ ہی ایک زمانے سے دوسرے زمانے میں بھی جاؤگے۔ اب نہ معلوم ہمیں کتنا سفر کرنا پڑے ہزاروں سال۔ مگر گھبراؤ نہیں، تمھارے پاس تو دنیا کی سب سے تیز سواری موجود ہے۔ خیال کا گھوڑا۔

یہ بات بھی غلط نہیں ہے کہ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب انسان کو خط کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اُس کی دنیا بہت چھوٹی تھی۔ پانچ سات غار یا وہ جنگل جہاں وہ اور اس کا پورا خاندان یا قبیلہ رہتا تھا۔ اس وقت نہ میں تھا نہ میری ضرورت۔ پھر تم نے ترقی کی، چھوٹے چھوٹے گاؤوں میں رہنا شروع کیا گاؤں دور دور آباد ہوئے، اور باقاعدہ سماجی زندگی شروع ہوئی۔ وہاں کبھی کبھی کچھ لوگوں کو ضرورت پیش آتی کہ آس پڑوس کے گاؤں والوں کو کوئی خبر بھیجیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے بس بھر طریقے بھی ڈھونڈلیے پیغام بھیجنے کے لیے ــــ آگ جلائی، دھواں اُڑایا، جھنڈیاں ہلائیں، ڈھول پیٹے، نفیری بجائی، لوگوں کو پیغام رٹانے، یاد رکھنے کے لیے نشانیاں دیں اور نہ معلوم کیا کیا کچھ کیا۔

زبانی خط۔ پتھر، تانبے، موم اور لکڑی کے خط

کچھ اچھا نہیں لگتا کہ اب میں اُن لوگوں کو بالکل ہی بھول جاؤں جن کا مجھ پر احسان ہے۔ پیغام پہنچانے والے یا پیغام بر۔ میں خود تو موجود نہیں تھا مگر یہ لوگ وہی کام کرتے تھے جو آج میں کرتا ہوں۔ آج تم اُن کی مصیبتوں اور ہمتوں کی کہانیاں سنو تو دنگ رہ جاؤ۔ اِن کی پریشانیوں کو یاد کرو تو تمہیں اپنے زمانے کی آسانیوں کا صحیح اندازہ ہو۔ اُس وقت ریل گاڑی اور موٹریں تو کیا سڑکیں اور ٹھیک ٹھیک راستے بھی نہ تھے۔ بس بادشاہ کا حکم تھا اور لوگوں کے دلوں میں لگن تھی۔

مصر کی ایک بہت پرانی آبادی میں مٹی کی ایک سل دبی ہوئی ملی ہے اس میں ایک شاہی پیغام بر کا حال لکھا ہے کہ جب وہ پیغام لے کر سفر شروع کرتا تھا تو پہلے اپنے تمام قرضے چکاتا تھا۔ اپنے مال کو بچوں میں بانٹ دیتا اور

سب سے آخری بار گلے مل مل کر رخصت ہوتا۔ اِس تختی کے متعلق خیال ہے کہ اِس پر یہ حال حضرت عیسٰی کی پیدائش سے کوئی دو ڈھائی ہزار سال پہلے کھودا گیا تھا۔

کچھ بہت پرانے زمانے کے یونانی پیغام بروں کا ذکر بھی سُننے میں آتا ہے اور اُن کی رفتار پر حیرت ہوتی ہے۔ ایک بار ایک ایرانی بادشاہ دارا نے یونان کے شہر ایتھنس پر حملہ کیا تو ایتھنس کی فوج نے ایک شخص فیڈیپاس کو اپنے دوست اِسپارٹا والوں کے پاس مدد مانگنے کے لیے دوڑایا۔ کہتے ہیں کہ فیڈیپاس نے ایتھنس سے اِسپارٹا تک کا ایک سو چپاس میل کا راستہ صرف چوبیس گھنٹوں میں طے کر لیا۔

کچھ لوگوں نے مجھے کبوتروں کی مدد سے بھی ایک سے دوسری جگہ پہنچانے کا طریقہ ایجاد کیا۔ بات یہ ہے کہ کبوتر اپنے گھر کو بہت پہچانتا ہے۔ بس بہت پُرانے زمانے میں مصر، ہندستان، اور عرب کے لوگوں کی سمجھ میں یہ بات آگئی اور اِن لوگوں نے کبوتروں کی مدد سے اپنے پیغام بھیجے۔ اور بھی کیا ایسی کتنی ہی باتیں پُرانی تاریخ میں سُننے کو ملتی ہیں۔ خیر یہ پیغام پہنچانے کا سلسلہ الگ ایک کہانی ہے جسے پھر کبھی سُننا۔ مجھے تو اپنے سفر سے کام ہے۔ اگر اِدھر اُدھر بہکا تو کھو جاؤں گا۔

میں تو وہاں سے چلوں جب تم نے لکھ کر پیغام بھیجنا شروع کیا۔ اِس لیے کہ خط تو اُسی وقت کام میں آسکتا ہے جب لوگوں کو لکھنا پڑھنا آتا ہو۔

لو دیکھو جنگلوں، بیابانوں، دریاؤں، پہاڑوں سے ہوتا ہوا ایک حبشی چلا جا رہا ہے۔ پورا جسم ڈھکا ہوا ہے، سر بھی ڈھکا ہے، تھکن سے چور ہے مگر اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ وہ ایک قبیلے کے سردار کے پاس پہنچا اور اپنے کپڑے اُتار کر کھڑا ہو گیا۔ سردار نے اس کے سارے جسم کو غور سے دیکھا۔ دیکھا نہیں پڑھا۔ اُس کے پورے جسم پر کچھ پیغام گدا ہوا ہے۔

ہاں! ممکن ہے یہی سب سے پہلی شکل ہو میری۔ تم کہو گے یہ تو بڑا ظلم ہے کہ اپنی بات کسی کو پہنچانے کے لیے کسی کے جسم کو گود ڈالا جائے۔ ٹھیک ہے بھائی پہلے لوگ غلام رکھتے تھے، اور ان سے ایسے کام بھی لیتے تھے۔ اور پھر کرتے بھی کیا؟ نہ قلم نہ دوات نہ کاغذ اور یہ بھی خیال تھا کہ خود پیغام لے جانے والے کو بھی پتہ نہ چلے کہ وہ کیا کہنے جارہا ہے۔ لیکن تم خود ہی سوچ سکتے ہو کہ اس کام میں زیادہ آسانی نہ تھی۔ چونکہ ایک بار گودے ہوئے جسم پر دوبارہ کچھ نہیں گودا جاسکتا۔ چنانچہ بادشاہوں اور امیروں نے پتھر کی سلوں پر خط لکھنا اور بھیجنا شروع کیا۔ پتھر کی سل لی، اس پر چھینی یا نوک دار کیل سے نقش بنائے اور پیغام بر کو بھیج دیا۔ ایسے پتھر کے خطوں کی مثال دنیا کی شاید ساری ہی پرانی آبادیوں میں مل جاتی ہے۔ خود تمھارے ہی ملک کے پرانے رہنے والے دراوڑ لوگ بھی پتھر پر نقش بنا کر خط بھیجتے تھے۔ مصر کی پرانی آبادی میں خط اسی طرح بھیجے جاتے تھے۔

ممکن ہے تم کہو کہ غریب پیغام بر نہ ہوا بوجھ اٹھانے والا مزدور ہوگیا تیز چل نہیں سکتا، جنگلی جانور آجائے تو بھاگ نہیں سکتا، دریا میں آسانی سے تیر نہیں سکتا۔ بھیجنے والے بھی بہت زیادہ لکھ کر نہیں بھیج سکتے بس اسی وجہ سے تلاش شروع ہوئی کہ ایسی ہلکی چیز تلاش کرلی جائے جس پر آسانی سے لکھا بھی جاسکے اور اسے لے جانے میں بھی کچھ آسانی ہو۔ کچھ لوگوں نے مٹی کی کچھ موٹی باریک سلیٹیں سی بنائیں اور گیلی ہی سلیٹوں پر کسی نوکیلی چیز سے لکھ دیا، پھر انہیں سکھا دیا۔ اسی طرح اور بہت سی چیزوں کو خط لکھنے کے لیے لوگوں نے استعمال کیا۔ مصر، بابل اور ایشیا کے بہت سے علاقوں سے ایسے بہت سے خط زمین میں دبے ہوئے ملے ہیں جو سلیٹ کے پتھروں، سیسے، تانبے یا کانسے کی تختیوں پر آج سے تین چار ہزار سال پہلے لکھے گئے تھے۔ ایک اور ہلکا خط بھی لوگوں نے ایجاد کیا۔ موم کی چھوٹی

بڑی تختیاں بنائیں اور اُن پر نوک دار چیز سے اپنا خط کُرید دیا۔ پھر اِن کے چاروں طرف لکڑی کا ایسا چوکٹا سا چڑھا دیا جیسا آج کل تمہاری سلیٹ کے چاروں طرف ہوتا ہے۔ اب اگر اِس چوکٹے میں سوراخ کر کے بہت سی سلیٹوں کو ایک ساتھ پرو دیا جائے تو انھیں لے جانے میں بھی آسانی ہو جاتی۔ یہ ہلکی بھی بہت تھیں۔ ایک اور بہت اچھی بات بھی تھی اِن خطوں میں۔ اِسے ذرا سا گرم کیا، اُس پر ہاتھ پھیرا، دیکھیے وہ پھر چکنا ہو گیا، اب اس پر دوبارہ بھی لکھا جا سکتا ہے۔ یہ اور ایسی بہت سی چیزوں کے لیے، جنھیں لوگوں نے کاغذ کی جگہ استعمال کیا، ان کی جگہیں بتانا مشکل ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کس ملک کے بادشاہ نے سب سے پہلے تانبے کی سلیٹ پر خط لکھ کر بھیجا یا کس نے موم کی تختی پہلے استعمال کی۔ بس جس کو جس چیز میں آسانی نظر آئی اُس نے اُسے ہی استعمال کرنا شروع کر دیا۔

کاغذ کے بزرگ

خط لکھنے کے لیے لگ بھگ کاغذ ہی جیسی دو تین چیزیں اور بھی کچھ جگہوں پر استعمال کی گئیں۔ خیر وہ اتنی ہلکی تو نہ تھیں جتنا آج کا کاغذ ہوتا ہے لیکن پھر بھی اُن کا ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا پتھر کی سلوں کے اٹھائے اٹھائے پھرنے کے مقابلے میں ضرور آسان تھا۔ ایک تو تھی جھلّی یہی جھلّی جو جانوروں کے گوشت پر چڑھی ہوتی ہے۔ پہلے گرم پانی میں اُبال کر اس کی چکنائی صاف کی، پھر اسے پھیلا کر خشک کر لیا۔ اس کے بعد اِسے چکنے پتھر سے خوب گھس لیا۔ لیجیے صاحب کئی ہزار سال پہلے کا کاغذ تیار ہو گیا۔ کم از کم خط لے جانے والے کو تو آسانی ہو ہی گئی۔ اگر تمہارا جی چاہے تو تم کسی بڑے شہر کے عجائب گھر چلے جاؤ، وہاں تمھیں بہت پرانی کتابیں جھلّی پر لکھی ہوئی نظر آ جائیں گی۔ ہندستان میں بہت

پرانے زمانے میں بھوج پتر پر خط لکھے جاتے تھے۔ لکڑی کی چھال اور خود لکڑی کی تختیوں کو چکنا کر کے اُن پر بھی ہمارے بزرگ خط لکھا کرتے تھے۔

اچھا تمہیں پتہ ہے آج تم جس کاغذ پر لکھتے ہو وہ کاہے سے بنتا ہے؟ اِس میں سب سے بڑا حصّہ لکڑی کے گودے کا ہوتا ہے۔ مصر میں دریائے نیل کے کنارے ایک پودا اُگتا ہے جسے پیپائرس (PAPYRUS) کہتے ہیں۔ اس کی لکڑی سے یہاں کے لوگ باریک باریک ورقیاں سی کاٹ لیتے تھے پھر انہیں ایک دوسرے پر آڑا ترچھا رکھ کر اور چپکا کر سکھا لیتے تھے۔ پھر انہیں چکنے پتھروں سے گھوٹا جاتا تھا۔ یہی مصریوں کا کاغذ تیار ہو گیا۔ اور ہاں، انگریزی میں کاغذ کو کیا کہتے ہیں ؟پیپر، (PAPER) اِس لیے اگر تم چاہو تو پیپائرس کو پیپر، یا کاغذ کی ماں کہہ لو۔

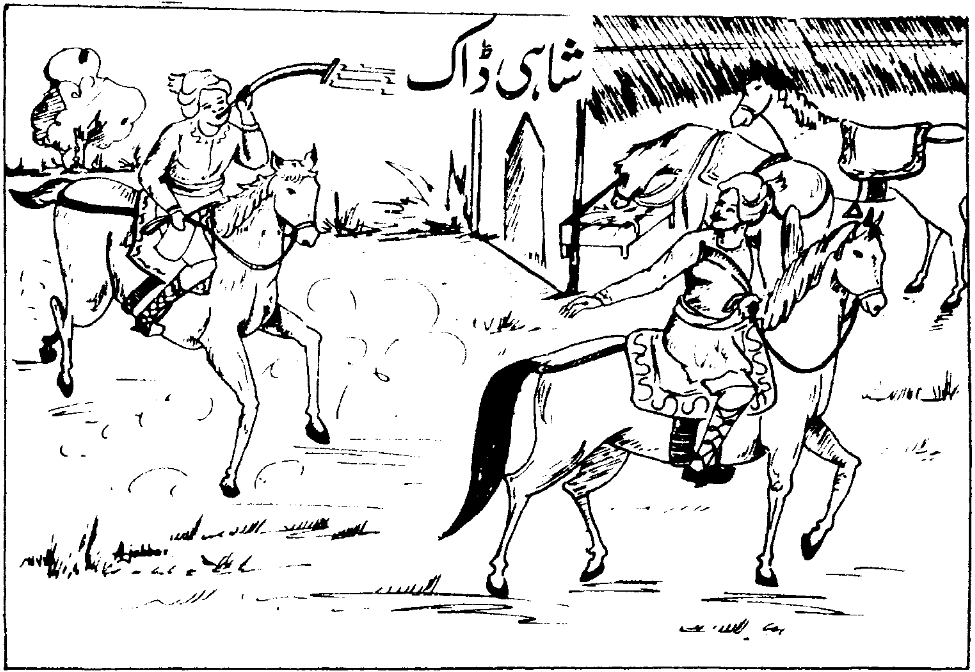
مَیں اپنی کہانی سناتے سناتے اِدھر اُدھر بہک جاتا ہوں۔ شاید اِس لیے کہ میں نے عجیب عجیب زمانے دیکھے ہیں۔ اور پھر یہ تانبے کی تختیاں، پیڑ کی چھال، لکڑی کی تختیاں، بھوج پتر وغیرہ تو میرے پُرانے ساتھی ہیں۔

کچھ آج ہی جیسا کاغذ تیار کرنے کی ترکیب چینیوں کی سمجھ میں سب سے پہلے آگئی۔ آج سے کوئی اٹھارہ انیس سو سال پہلے چینی بادشاہ کے ایک وزیر سائی کون نے لگ بھگ اِسی اصول پر کاغذ تیار کر لیا جس پر یہ آج بنتا ہے۔ مگر اِس کو ساری دنیا میں پھیلنے میں کئی سو سال لگ گئے۔ شاید اٹلی میں سب سے پہلے کاغذ بنانے کے کارخانے ۱۲۷۶ء میں کھلے۔

اپنے اِس سفر کے بارے میں ایک بار پھر تمہیں کچھ باتیں یاد دلا دوں۔ پہلی بات تو یہی کہ خط بھیجنے کی یہ آسانی شہر یا گاؤں میں رہنے والے عام آدمی کے لیے نہیں تھی۔ ہر شخص کے پاس پیغام بر بھی نہ تھے، اور اسے پڑھنا لکھنا بھی نہیں آتا تھا۔ عام آدمی کی دنیا ہی بہت چھوٹی تھی۔ آس پاس کے گاؤں میں اگر کسی سے کوئی بات کہلوانی ہوئی تو کسی جانے والے سے کہہ دی۔

اِس وقت پیغام بھیجنے کی خاص ضرورت بادشاہوں یا بہت امیر آدمیوں کو پڑتی تھی، اور یہی لوگ اپنے پاس پیغام بر بھی رکھتے تھے اور ایک بات یہ بھی تھی کہ اِس پیغام پہنچانے میں صرف تین آدمی شریک ہوتے تھے۔ پیغام بھیجنے والا، پیغام لے جانے والا اور وہ جسے پیغام بھیجا گیا ہے۔ اِسی لیے ہم اس سلسلے کو صرف 'پیغام رسانی' کہہ سکتے ہیں۔ یہ بات میں تمہیں اس لیے بتا رہا ہوں کہ آج کی 'ڈاک' میں اور اُس زمانے کی 'پیغام رسانی' میں بڑا فرق ہے۔

ذرا سوچو کہ آج اگر ایک آدمی تمہارا خط لے کر بمبئی جائے، پھر ایک آدمی بمبئی سے کلکتے جائے اور پھر کلکتے سے ایک اور آدمی مدراس جائے، تو تمہاری اتنی تیز سواریوں کے بعد بھی ہندستان کے سارے خطوں کو پہنچانے کے لیے شاید ملک کی آدھی آبادی تو دوڑتی ہی رہے گی۔ بات یہ ہے کہ اب بہت سے لوگ مل کر کام کرتے ہیں، اور اسی لیے یہ کام اتنی آسانی سے ہو جاتا ہے۔ خیر اس بات کو میں آگے چل کر بتاؤں گا۔ ابھی تو تمہیں کچھ اور دلچسپ زمانوں میں گھما دوں۔


شاہی ڈاک

کئی آدمیوں کی دوڑ

اچھا تم نے کبھی اپنے اسکول کے کھیل کود کے مقابلوں میں ریلے دوڑ یا "ریلے ریس" میں حصّہ لیا ہے؟ اس میں صرف ایک لڑکا نہیں دوڑتا بلکہ کئی لڑکے مل کر دوڑ کو پورا کرتے ہیں۔ پہلے لڑکے کے ہاتھ میں کوئی چیز دے دی، وہ دوسرے لڑکے تک دوڑتا ہوا گیا، اور وہ چیز اُسے تھمادی، اب اُس نے دوڑنا شروع کیا۔ اسی طرح آخری لڑکا اُس چیز کو لے کر مقررہ جگہ پر پہنچ گیا۔ جس ٹیم کا لڑکا پہلے پہنچا وہ پوری ٹیم جیت گئی۔

کچھ بادشاہوں نے سوچا کہ اگر اسی "ریلے" کے طریقے کو خط پہنچانے میں بھی کام میں لایا جائے تو ان کا خط جلدی پہنچ سکتا ہے۔ چونکہ ایک آدمی تو زیادہ سے زیادہ دس پانچ میل چل کر تھک جاتا ہے۔ اب اگر اسی کام کو کوئی تازہ دم آدمی کرے تو وہ پھر اتنی ہی تیزی سے چل سکتا ہے۔ یہ طریقہ بالکل نیا بھی نہیں تھا۔ دس بیس ہزار سال پہلے سے لوگ اشاروں کے ذریعے پیغام پہنچانے میں اسی طریقے کو استعمال کرتے تھے۔ جیسے ایک پہاڑی پر ڈھول بجایا گیا، جس کا مطلب ہے کہ حملہ ہوگیا ہے، کچھ دور کے رہنے والے قبیلے نے سُنا اور اس نے بھی ڈھول بجایا تو اگلی آبادی کو خبر ہوگئی ــــ بس یہی طریقہ مجھے بھیجنے میں بھی استعمال کیا گیا۔ انسان تو ہر آسانی ڈھونڈنے میں لگا رہتا ہے، اور کچھ منچلے لوگوں کی لگن اور ہمت ہی تمھاری دنیا کی ترقی کا راز ہے۔

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس "ریلے" کے طریقے سے ڈاک بھیجنے کے طریقے

کو سب سے پہلے چین کے بادشاہوں نے اب سے کوئی چار ہزار سال پہلے شروع کر دیا تھا، مگر چین میں اپنانے گئے اِس طریقے کا پورا حال نہیں مل پاتا۔ تاریخ والوں کا خیال یہ ہے کہ بالکل ٹھیک ٹھیک ڈھنگ سے اس طریقے کو ایران کے ایک بہت بڑے بادشاہ سائیرس نے شروع کیا تھا۔ یہ بادشاہ حضرت عیسیٰ سے کوئی ساڑھے پانچ سو سال پہلے حکومت کرتا تھا۔ اُس نے گھوڑ سواروں کے ذریعے ڈاک لانے لے جانے کا انتظام کیا۔ اتنی اتنی دور پر ڈاک کی چوکیاں بنوائیں کہ ایک گھوڑ سوار دن بھر میں وہاں پہنچ جاتا تھا۔ وہاں سے ایک تازہ دم گھوڑے پر سفر شروع ہوتا تھا۔ اِس کا طریقہ کچھ ایسا ہی پکّا تھا کہ اس کے دشمن ایک یونانی تاریخ داں ہیروڈوٹس نے بھی یہ بات مان لی تھی اور لکھا تھا "بارش، برف، دن کی گرمی اور رات کا اندھیرا غرض کوئی چیز بھی یہاں کی ڈاک کے دوڑنے والوں کو اپنا مقررہ کام پورا کرنے سے نہیں روک سکتی" اور پھر اِس کے ڈھائی ہزار سال بعد اسی بات کو ایک پتھر پر کھود کر امریکہ کے ایک ڈاک خانے پر لگا دیا گیا ہے۔ ایران کے بعد یہ طریقہ ساری دنیا میں اپنایا جانے لگا۔

لیکن شاید رومیوں نے اس میں سب سے زیادہ ترقی کی۔ ان لوگوں نے گھوڑوں کی جگہ ایک ایسی گاڑی کو کام میں لانا شروع کیا جسے تم آج رتھ کہہ سکتے ہو۔

تمہارے اپنے ملک میں میرا اِس طرح آنا جانا، شاید سب سے پہلے چندرگپت موریا بادشاہ کے زمانے میں ہوا۔ یہ بادشاہ حضرت عیسیٰ سے کوئی سوا تین سو سال پہلے ہوا ہے۔ بہت بڑا بادشاہ تھا اور ہر بڑے بادشاہ کو میری ضرورت پڑتی ہے۔ دور دور کے صوبوں کا حال معلوم کرنے کے لیے، وہاں مقرر کیے گئے افسروں کو حکم بھیجنے کے لیے اور بہت سے کاموں کے لیے چندرگپت موریا کے یہاں باقاعدہ ڈاک آتی جاتی تھی۔ تاریخ کے عالم بتلاتے ہیں کہ اس کی حکومت میں ڈاک

کا ایک الگ دفتر بھی تھا۔ ملک کی مغربی سرحد کے آخری حصّے سے اپنی راج دھانی پاٹلی پتر تک اُس نے بہت اچھی سڑکیں بنوائیں ہر میل پر پتھر لگوائے جن پر موڑوں اور راستوں کی پوری خبر دی جاتی۔ خط کا آنا جانا اُس کے دربار میں ایک عام بات سمجھی جاتی تھی۔ اس کے وزیر کوٹلیا نے اِس دفتر میں کام کرنے والے 'ہرکاروں' کی الگ الگ تنخواہیں مقرر کیں جن کا ذکر اُس کی کتاب ارتھ شاستر میں مل جاتا ہے۔

ہرکارا

تم نے شروع میں میرے لے جانے والے کا نام "ہرکارا" سُنا تھا۔ پہلے زمانے میں اِس کا ایک حصہ یعنی 'کارا' ہی خط لے جانے والے کا نام تھا۔ 'کارا' اصل میں سنسکرت کا لفظ ہے جس کے معنی جاسوس کے ہوتے ہیں۔ اس زمانے میں ہرکارا خط تو لے جاتا ہی تھا لیکن چونکہ وہ جگہ جگہ گھومتا بھی تھا، اِس لیے اُسے بہت سی ایسی باتوں کی بھی خبر ہوتی تھی جو عام لوگوں کو معلوم نہیں ہوتی تھیں۔ ممکن ہے اِسے 'کارا' یا جاسوس اِسی لیے کہتے ہوں کہ بادشاہ اور سرکاری افسر اِس سے دور دور کی خبریں بھی معلوم کرتے ہوں۔ بعد میں اِس لفظ کے ساتھ نہ معلوم کیسے 'ہر' اور جڑ گیا اور اس کا نام 'ہرکارا' ہوگیا۔ اب سے کوئی ساٹھ ستر سال پہلے تک آج کے ڈاکیے کو 'ہرکارا' ہی کہا جاتا تھا۔

عرب اور مصر کے بادشاہوں نے بھی اپنے لیے ڈاک کا بڑا اچھا انتظام کیا۔ خلیفہ ہارون رشید کا نام تو تم نے سُنا ہوگا۔ اس کی ڈاک میں اس کے خطوں کے علاوہ حکومت کا ضروری سامان بھی آتا تھا، اور مصر کے مملوک بادشاہ جو تیرھویں، چودھویں، اور پندرھویں صدی میں وہاں راج کرتے تھے، ان کی ڈاک کا تو یہ حال تھا کہ شام کے شہر دمشق سے مصر کی راج دھانی قاہرہ تک ڈاک کے

ذریعے برف بھی پہنچائی جاتی تھی ۔ ٹھیک ہے بھائی ! بادشاہ کا حکم تھا، اور بادشاہی حکم کو تو موت کی برابر کہا ہی گیا ہے ۔

اِس زمانے کا چین کا حال ایک سیّاح مارکوپولو نے لکھا ہے ۔اِس وقت یہاں منگول بادشاہ قُبلائی خان حکومت کرتا تھا۔ مارکو پولو نے لکھا ہے کہ پورے ملک میں دس ہزار چوکیاں تھیں اور دو لاکھ گھوڑے ہر وقت تیار کھڑے رہتے تھے۔ ایک خاص بات یہ تھی کہ معمولی خطوں کو ہرکارے لے کر دوڑتے اور جلدی جانے والی ڈاک گھوڑوں پر چلتی تھی ۔ ہر چوکی پر ایک منشی ہوتا تھا جو آنے والے ہرکارے کی رسید دیکھ کر ایک نئی رسید اُسے دیتا تھا۔ اس طرح پوری ڈاک کے متعلق یہ بھی پتہ رہتا تھا کہ وہ کس کس کے ہاتھ سے گذری ہے ۔اُس نے لکھا ہے کہ اُس وقت عام ڈاک دس دن کا سفر چوبیس گھنٹے میں طے کر لیتی تھی ۔گھوڑ سوار جب کسی چوکی کے پاس پہنچتا تو زور سے اپنی نفیری بجاتا اور دوسرا گھوڑا اُس کے لیے تیار کھڑا کر دیا جاتا ۔گھوڑ سوار سرپٹ دوڑتا ہوا آتا اور کود کر دوسرے گھوڑے پر چڑھ جاتا۔ دریاؤں پر کشتیاں بھی بالکل تیار کھڑی رہتیں ۔

پچاس دن کا سفر پانچ دن میں

میں نے تمہیں پہلے بھی بتلایا تھا کہ بادشاہوں کا کام میرے بغیر نہیں چل سکتا۔ اِس لیے انہوں نے اپنے بس بھر میرے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے میں نئے نئے کام کرنے کی کوشش کی ۔ ہمارے ملک میں بھی ہر بادشاہ کے راج میں ڈاک کا ذکر ضرور ملتا ہے ۔

ایک سیاح ابنِ بطوطہ نے محمد شاہ تغلق کے زمانے کی ڈاک کے بارے میں لکھا ہے کہ ملتان سے دلی تک پچاس دن کا راستہ تھا، لیکن ڈاک صرف پانچ دن میں پہنچ سکتی تھی ۔ ڈاک چوکی کو 'داوا' یا 'ڈھاوا' کہا جاتا تھا اور اِس میں

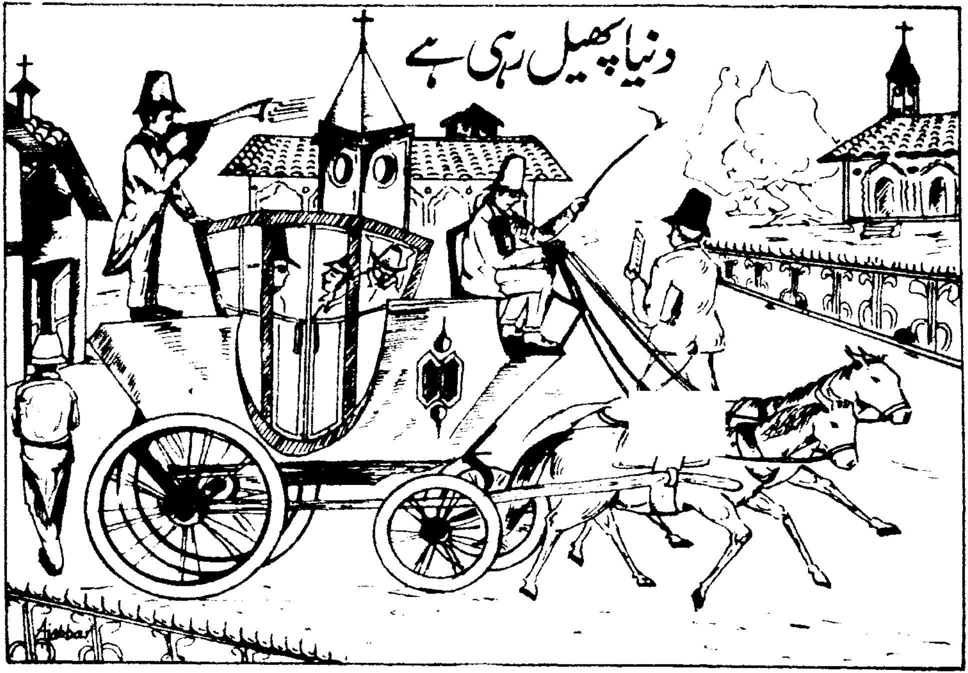
ہر وقت ایک ہرکارا کمر باندھے تیار کھڑا رہتا تھا۔ جب وہ دوڑتا تو اُس کے ایک ہاتھ میں دو گز لمبی چھڑی ہوتی جس میں گھنگرو بندھے ہوتے، اور دوسرے ہاتھ میں لفافہ ہوتا۔ اِسی ڈاک میں بادشاہ کے لیے خراسان (ایران) سے پھل بھی آتے تھے۔ اور سب سے زیادہ مزے کی بات یہ کہ بہت سخت مجرم کو چارپائی سے باندھ کر اسی ڈاک کے ذریعے بادشاہ کے پاس بھیج دیا جاتا تھا۔ چلو بعد میں کچھ بھی ہو، اتنی دیر تو مجرم کو بھی مزہ آتا ہوگا۔

اِسی طرح شیر شاہ سوری نے بھی اپنی ڈاک کے لیے بہت کچھ کیا۔ اِس نے ہندستان میں سب سے زیادہ سڑکیں بنوائیں، اور تم جانتے ہی ہو کہ پرانے زمانے میں جتنی اچھی سڑکیں ہوتی تھیں میرا سفر اتنا ہی آسان ہوتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے راج میں سب مِلا کر دو ہزار سے زیادہ سرائیں تھیں اور ہر سرائے میں گھوڑے اور پیدل چلنے والے تیار کھڑے رہتے تھے۔ اِس کے زمانے میں کسی خط کی رفتار ایک دن میں تین سو میل بتائی جاتی ہے، اور اس کے بعد اکبر کے یہاں تو ان چوکیوں کا نام بھی ڈاک چوکی ہو گیا تھا۔

جب بادشاہوں کی ڈاک کا ذکر ہوتا ہے تو کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ یہ بادشاہ اپنی اور میری خدمت کے ساتھ ساتھ اگر تمہاری یا عام آدمی کی خدمت کا بھی خیال رکھتے تو نہ معلوم میں نے اب تک کتنی ترقی کر لی ہوتی اور تمھارے پر دادا کے پر دادا کو بھی خط ملنے لگے ہوتے۔ خیر چھوڑو ان بادشاہوں کے قصوں کو، آگے بڑھو۔ اگر ان بادشاہوں کا بس چلتا تو یہ تو کبھی بھی مجھے تمھارے پاس نہ پہنچنے دیتے۔ بات یہ تھی کہ انہیں ڈر رہتا تھا کہ اگر لوگوں میں خط آنے جانے لگے تو ممکن ہے اِن کے خلاف سازشیں ہونے لگیں اور ان کی حکومت کو خطرہ پیدا ہو جائے۔ ایسی حالت میں اگر کسی کو کوئی پیغام یا خط بھیجنا ہوتا تو وہ اپنا ہی کوئی آدمی بھیجتا، جو ظاہر ہے اکیلا ہونے کی وجہ سے آہستہ آہستہ جاتا۔ کچھ لوگ بے ایمانی سے شاہی ڈاک کے ذریعے اپنے خط بھی بھیج دیتے۔ مگر وہ بس تھوڑی سی دور تک

ہی جاپاتے۔ اس کے لیے انہیں ہرکاروں کو رشوت دینی پڑتی۔ بادشاہ کو اگر معلوم ہو جاتا تو وہ دونوں کو ہی بہت سخت سزا دیتا۔

اس میں تو شک نہیں کہ بادشاہوں کے اس طرح سوچنے سے میرے تم تک پہنچنے میں دیر لگی مگر اِن کے پاس میرے اتنے دِن رہنے سے آگے کے لیے ایک آسانی بھی ضرور ہوئی۔ اِن کی ڈاک نے ایک طریقہ یا نظام بنادیا اور لوگوں کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ اگر مل کر کام کیا جائے تو وہ کام جلدی ہو جائے گا۔ ایک آدمی خط لے کر اگر پچاس دِن میں کسی جگہ پہنچے گا تو بہت سے آدمی اِسی خط کو اُس جگہ پانچ دن میں پہنچا دیں گے۔ یہی اصول ہے جسے بعد میں کام میں لایا گیا، اور آج بھی لگ بھگ اسی اصول پر کام ہوتا ہے۔ ایک آدمی کا کام صرف اتنا ہے کہ شہر کے ایک حصّے میں جتنے بھی لیٹر بکس لگے ہیں اُن میں سے خط نکال کر انہیں ڈاک خانے پہنچا دے۔ کچھ لوگ انہیں صرف شہر کے بڑے ڈاک خانے پہنچانے کا کام کرتے ہیں، اور اِسی طرح کام بٹتا چلا جاتا ہے۔ خیر، تو میں کہہ رہا تھا کہ بادشاہوں کی ڈاک نے کم سے کم یہ نظام ضرور پکّا کر دیا۔ اچھا چلو اب اپنا اگلا سفر شروع کریں۔ ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ میں تمہارے ہاتھ میں کیسے اور کب آگیا۔ اس کے لیے ہمیں ابھی بہت سی جگہیں گھومنا ہیں۔ ہمارا اگلا سفر زیادہ تر یورپ کے ملکوں۔ اٹلی، فرانس، برطانیہ وغیرہ میں ہوگا۔ اصل میں اِن ملکوں نے ہی مجھے کچھ ایسا روپ دیا اور میرا سفر کچھ اِس انداز سے طے کرایا کہ اُس سے میں اپنی آج والی شکل میں تم تک پہنچنے کے قابل ہوگیا۔


دنیا پھیل رہی ہے

یوروپ کی سیر

دسویں صدی کے آس پاس یوروپ میں اور تو کوئی بات نہ تھی مگر اُس وقت وہاں گرجا گھروں اور خانقاہوں کا بڑا زور تھا۔ بڑے بڑے پادری اور پوپ ہوتے تھے، خانقاہوں میں راہب ہوتے تھے اور یہ لوگ بڑے زور شور سے مذہبی کاموں میں لگے رہتے تھے۔ ان لوگوں کو دُور دُور گرجا گھروں میں پیغام بھیجنے ہوتے، وہاں سے خبریں منگوانی ہوتیں۔ اِس طرح اِن کے پیغام بروں کا ایک سلسلہ مستقل بنا رہتا۔ یہ راہب یا پیغام بر صرف اپنے ہی ملکوں میں سفر نہ کرتے بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی جاتے۔ ویسے تو یہ صرف اپنے گرجا گھروں اور خانقاہوں کے خط لانے لے جانے کا کام ہی کرتے تھے مگر چونکہ نیک لوگ ہوتے تھے اور ان کے دل میں عام آدمی کی خدمت کا جذبہ بھی ہوتا تھا اِس لیے یہ اپنے راستے میں آنے والے گاؤں اور شہروں کے خط بھی لے لیتے۔ اِس طرح کچھ لوگوں کے خط پہنچ تو ضرور جاتے مگر یہ کوئی پکا طریقہ نہیں تھا۔

کچھ تبدیلی یوروپ کے عام رہن سہن میں بھی آئی۔ چھوٹے چھوٹے گاؤں بڑھ کر قصبے بنے اور کچھ قصبے پھیل کر شہروں میں بدل گئے۔ اِن شہروں کی آبادی اور گاؤں کی آبادی میں تھوڑا سا فرق بھی ہوتا تھا۔ گاؤں میں عام طور پر لوگ کھیتی باڑی یا چھوٹے موٹے گھریلو دھندوں سے روزی کماتے، اُن کی دنیا چھوٹی ہوتی، تعلقات بھی کم ہوتے، لیکن شہروں میں عام طور سے لوگ یا تو تجارت کرتے یا نوکری کرتے۔ گاؤں اور شہر کی آبادی میں اِس فرق نے خود میرے آگے بڑھنے

میں بڑا کام کیا۔ میں تو کہوں گا کہ اگر یہ بڑے شہر نہ ہوتے تو شاید میں اِس روپ میں تمھیں نظر ہی نہ آتا جس میں میں آج موجود ہوں۔ ایک بات تو یہ کہ گاؤں کے مقابلے شہر میں لوگ زیادہ پڑھے لکھے ہوتے ہیں وہ جگہ جگہ کی خبریں معلوم کرنا چاہتے ہیں اور دوسرے اُن کے کاروبار۔ یعنی تجارت، نوکریوں اور کارخانوں وغیرہ میں بھی خط کی ضرورت پیش آتی ہے۔ جس طرح کسی بادشاہ کا کام میرے بغیر نہیں چل سکتا، بالکل اسی طرح کسی تجارت، کارخانے یا کسی بڑے دھندے میں میری ضرورت ہوتی ہے۔ شہروں میں اسکول کھلتے ہیں، پڑھنے لکھنے کا چرچا بھی زیادہ ہوتا ہے۔ بس ان بڑے بڑے شہروں نے میرے سفر میں دو طرح مدد کی۔ ایک بڑے بڑے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے ذریعے اور دوسرے کارخانے داروں، تاجروں اور پیشہ وروں کے ذریعے۔

یوروپ کے لوگوں میں جب تعلیم کا شوق بڑھا تو انھوں نے بڑے بڑے کالج کھولے جو کچھ دن بعد یونیورسٹیاں بن گئے۔ تم نے کیمبرج آکسفورڈ اور پیرس یونیورسٹی کے نام ضرور سُنے ہوں گے۔ یہ سب بارھویں اور تیرھویں صدی میں قائم ہوگئی تھیں۔ اِن میں پورے یوروپ کے ملکوں سے لڑکے تعلیم حاصل کرنے آتے تھے اور وہیں رہتے تھے۔ اب اُس وقت بہت اچھی سواریاں تو تھیں نہیں کہ یہ لوگ اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں سے ملنے ہر چھٹی میں گھر چلے جائیں، اس لیے انہیں کبھی کبھی تو کئی کئی سال یہیں رہنا پڑتا تھا۔ تم خود سوچ سکتے ہو کہ ان کا جی چاہتا ہوگا کہ انھیں اپنے عزیزوں رشتے داروں کی خبریں ملیں، ان کے گھروں سے پیسے آئیں اور سال دو سال میں یہ لوگ اپنے گھر چلے جائیں۔

یونیورسٹی ڈاک

بس اِن طالبعلموں کی اس ضرورت نے ڈاک کے ایک طریقے کو پیدا کر دیا۔ تم

چاہو تو اُسے "یونیورسٹی ڈاک" کا نام دے دو۔ اِن ملکوں کی حکومتوں نے بھی اِن یونیورسٹیوں کو بہت سی آسانیاں دے دی تھیں، چنانچہ انہوں نے اِس ڈاک کے راستے میں بھی روڑے نہیں اٹکائے اور یہ سلسلہ لگ بھگ چار سو سال تک طالبعلموں اور کچھ عام آدمیوں کی خدمت کرتا رہا۔

اِس میں سب سے زیادہ پکا طریقہ پیرس یونیورسٹی کی ڈاک کا تھا جو تیرھویں صدی میں شروع ہوا اور چودھویں صدی تک بالکل پکا ہوگیا۔ اِس کے ہرکارے دُور اور نزدیک ہر جگہ جاتے۔ یہ ڈاک صرف فرانس میں ہی نہیں جاتی تھی بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی جاتی تھی۔ شروع شروع میں تو یہ ہرکارے صرف طالبعلموں اور استادوں کے خط ہی لاتے لے جاتے مگر کچھ دِن بعد انہوں نے چُھپے چوری عام آدمیوں کے خط بھی لے جانا شروع کر دیے۔ بعد میں یہ بات چھپی بھی نہ رہی، اور چودھویں صدی میں اِسے عام آدمی کے لیے خط بھیجنے کا ایک باقاعدہ طریقہ مان لیا گیا۔ پھر اور کچھ دن بعد خود یونیورسٹی نے ڈاک کا کام اپنے ہاتھ میں لے لیا، اور اِس آمدنی سے یونیورسٹی کا بہت سا خرچ پورا ہونے لگا۔

آؤ تمہیں دکھاؤں۔ کالج کے پاس لوگ جمع ہیں۔ بوڑھی عورتیں، اور جوان سب ہی ہیں۔ طالبعلم زیادہ ہیں اور سب کی دیکھا دیکھی بچّے بھی جمع ہو گئے ہیں۔ اب جب اتنے بہت سے لوگ جمع ہوں تو خوانچے والے اور پھیری لگانے والے بھلا کیوں چوکیں۔ وہ بھی موجود ہیں۔ ایک میلا سا لگا ہے۔ اچھا! آج کسی دور جگہ سے ڈاکیا آنے والا ہے۔

یہ تھا یونیورسٹی ڈاک کا طریقہ۔ اب میں تم سے اور قریب آگیا ہوں۔ سب کے ہاتھ میں نہ سہی مگر کچھ عام آدمیوں کے ہاتھوں میں تو پہنچنے ہی لگا ہوں۔ میں نے پہلے بھی تم سے کہا تھا کہ میرا اور پڑھائی لکھائی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ تم خود دیکھ لو، آج بھی اُس شخص کو تم لوگ پڑھا لکھا مانتے ہو جو کم سے کم خط لکھ پڑھ سکتا ہو۔ جہاں پڑھائی لکھائی ہے وہاں میری ضرورت ہے اور جب انسان کو کسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ راستے بھی تلاش کر لیتا ہے۔

مگر اِس نظام میں ایک بات بُری تھی۔ میں مہنگا بہت تھا۔ اِسی لیے کم پیسے والے یا غریب محنت مزدوری کرنے والے میرا فائدہ نہیں اٹھا پاتے تھے، اور دوسری بات یہ کہ میری قیمت میرے سفر کے بعد لی جاتی تھی۔ یعنی جتنی دور سے میں چلا ہوں اتنا ہی زیادہ میرا خرچ ہوگا۔ آج کی طرح نہیں کہ تم نے دس پیسے کا پوسٹ کارڈ خریدا اور راس کماری سے سری نگر بھیج دیا۔ اگر اُس وقت تم اتنی دور خط بھیجنا چاہتے تو یہ تمھارا کئی مہینے کا جیب خرچ کھا جاتا۔ میں اتنا سستا تو بہت بعد میں ہوا ہوں۔ اِسے تم اور آگے چل کر سنوگے۔

قصائی ڈاک

اچھا اب دیکھیں کہ مجھے شہروں نے اور کیا کیا کچھ دیا۔ ہر شہر میں کچھ بڑے بڑے تاجر ہوتے تھے، اور کچھ ایک ہی جیسا کام کرنے والے پیشہ ور لوگ ہوتے تھے۔ جیسے بڑھئی، دھوبی، لوہار، قصائی وغیرہ۔ ایک سے سامان کی تجارت کرنے والے۔ جیسے غلّے کے بیوپاری کپڑے کے بیوپاری وغیرہ۔ انھیں آپس میں تال میل رکھنا ہوتا تھا اور پھر شہر سے باہر دُور دُور پیغام بھیجنے ہوتے تھے۔ ایک سے پیشہ وروں نے بھی اپنی کچھ ایسی انجمنیں بنالی تھیں جن کا کام تھا آس پاس کے ایک سے پیشہ وروں کو بازار کے حالات اور اپنے کام کے بارے میں بتلاتے رہنا اور دوسروں کی خبر رکھنا۔ چنانچہ یوروپ کے ہر ہر شہر میں اِن کے الگ الگ پیغام رسانی کے سلسلے چلتے رہے۔ اور پھر وہی ہوا کہ اِن لوگوں نے شروع میں صرف اپنے اپنے خط پہنچانے کا کام کیا اور بعد میں عام آدمیوں کے خط بھی لے جانے لگے۔ یہ کام بغیر پیسے لیے تو ہوتا نہیں تھا۔ اب اور آسانی ہوئی۔ اپنا کام الگ ہو رہا ہے اور اُس کا خرچ اس خط پہنچانے کے کام سے نکل رہا ہے، جس میں بہت زیادہ وقت نہیں خرچ کرنا پڑتا۔

آؤ تمھیں یوروپ کے کچھ شہروں میں ایک عجیب منظر دکھاؤں ہم آج سے کوئی

تین سو سال پیچھے لوٹ رہے ہیں۔ دیکھو یہ اِس شہر کا مذبح خانہ ہے، یہاں جانور کاٹے جاتے ہیں اور پورے شہر اور چاروں طرف کے علاقوں میں گوشت یہیں سے جاتا ہے۔ مگر تم سوچ رہے ہوگے کہ مذبح خانے یا قصائیوں کا خط سے کیا کام ۔ بار بھائی پڑا تھا ایک بار میرا کام قصائیوں سے بھی۔ مگر میں بھولوں گا نہیں ان کا مجھ پر بڑا احسان ہے۔ خیر وہ دیکھو قطاریں اِن کی بہت سی گھوڑا گاڑیاں کھڑی ہیں۔ کچھ پر گوشت لد چکا ہے کچھ پر لادا جا رہا ہے۔ مگر ذرا غور سے دیکھو، یہ صاحب کیا کر رہے ہیں ؟ خط لے رہے ہیں۔ ”نہیں صاحب، یہ خط اس نمبر کی گاڑی سے نہیں جائے گا آپ وہ دیکھیے، اُدھر چلے جائیے۔ جی ہاں ! وہاں سے پچھتر نمبر کی گاڑی اُدھر جاتی ہے۔ ہاں میڈم، آپ کا خط پہنچ جائے گا، ہم جاتے ہیں۔ اس بازار میں۔ آپ اطمینان رکھیے۔ ارے بالڑکی تم ذرا دیر سے آئیں۔ بس ابھی چند منٹ پہلے آخری گاڑی اُس طرف گئی ہے۔ دیکھو کل اٹھنے میں دیر نہ کرنا۔“ جی ہاں، قصائیوں کی انجمن نے سوچا کہ اِن کا تو کام ہی بازار بازار، گلی گلی گھومنا ہے۔ کیوں نہ اسے ڈھنگ سے منظم کر کے اس کے ذریعے لوگوں کے خط بھی پہنچائیں۔ یہ لوگ راستے میں بھی لوگوں کے خط لے لیتے ہیں اور چوں کہ دن بھر اِن کے لوگ اِدھر اُدھر گھومتے ہیں اس لیے گوشت بیچنے کے ساتھ ساتھ خط بھی تقسیم کرتے جاتے ہیں۔

یہ قصائی جب کسی بازار میں پہنچتے تو زور سے اپنی نفیری بجاتے اور آس پاس کے لوگ جمع ہو جاتے اپنے خط لے لیتے اور کچھ خط دے دیتے۔ ”قصائی کی نفیری“ یوروپ میں اس زمانے کا ایک خاص لفظ بن گئی تھی ــــ اور اِس طریقے کو یوروپ میں ”قصائی ڈاک“ کا نام دیا گیا تھا۔ بس اِس میں ایک بات خاص تھی اور یہی اس کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ وہ یہ کہ اِس کا پھیلاؤ صرف شہر کے اندر ہی اندر یا شہر کے آس پاس کے علاقوں میں ہی تھا، اِس سے آگے نہ بڑھتا تھا۔ لیکن پھر بھی اس سے کچھ لوگوں کی ضرورت تو پوری ہو ہی جاتی تھی۔

لوگوں کا خیال یہ ہے کہ اسی قسم کے چھوٹے چھوٹے ڈاک کے طریقوں کو دیکھ کر بعد

میں لوگوں کو 'شہری ڈاک' کا خیال پیدا ہوا۔ اور اب دنیا کے ہر بڑے شہر میں پورے ملک کی ڈاک کے علاوہ ایک 'شہری ڈاک' کا نظام بھی ہوتا ہے۔ یورپ کے بعض شہروں میں تو اِس نظام نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ اگر شہر کے اندر کسی دوست کو کوئی خط صبح بھیجا جائے تو شام تک اُس کا جواب آنے کی امید کی جاسکتی ہے۔

خود تمھارے ہی ملک میں سترھویں اور اٹھارویں صدی میں کچھ مہاجن بھی اِسی طرح کا کام کرتے تھے۔ اِس کا حال میں تمھیں آگے چل کر سناؤں گا۔

یورپ کے ملکوں میں بڑے بڑے تاجروں نے بھی اِس چکر کو بڑھانا شروع کیا۔ وہ دوسرے شہروں میں اور دُور دُور جگہوں تک بھی خط بھجواتے تھے۔ اس میں خط عام طور پر پہنچ تو ضرور جاتے تھے۔ مگر یہ نظام اتنا پکّا نہیں ہو سکا جیسا بادشاہوں کا نظام تھا۔ اِن کے پاس بادشاہوں جتنی طاقت بھی نہیں تھی اور 'ریلے' کا طریقہ بھی یہ بادشاہوں کی طرح نہیں چلا سکتے تھے۔ پھر اِن کے پاس نہ فوج نہ پولس، ڈاکوؤں چوروں کا خطرہ، راستے خراب غرض ہزار پریشانیاں۔ شروع میں تو اِن تاجروں نے بھی صرف اُن جگہوں تک خط بھیجے جہاں ان کا اپنا سامان جاتا تھا، مگر بعد میں دوسری جگہوں پر بھی خط جانے لگے۔

بس مجھے اِس وقت کی جو بات سب سے زیادہ کھلتی ہے وہ میرے سفر کا خرچ ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس وقت ایک معمولی مزدور کی پورے ایک ہفتے کی کمائی ایک خط وصول کرنے میں خرچ ہو جاتی تھی۔ اب ظاہر ہے کہ غریب آدمی تو اتنا پیسہ خرچ نہیں کرسکتا تھا۔ لیکن پھر بھی میرے سفر میں یہ بھی ایک بہت خاص منزل ہے۔ اب پہلی بار وہ وقت آیا تھا کہ عام آدمی کے پاس میرے پہنچنے میں پیسے کے علاوہ کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ یہ رکاوٹ بھی دور ہوگئی لیکن اس میں بھی کوئی چار پانچ سو سال لگ گئے۔

ہاں ایک بات اور کہوں گا۔ تاجروں یا پیشہ وروں کی انجمنوں کی ڈاک، یہ کام اِن کے اصلی کاروبار نہیں تھے۔ ڈاک پہنچانے کا کام تو اِن لوگوں نے اپنے کاروبار

کے ساتھ ویسے ہی کر لیا تھا۔ ان کے یہاں خط کو پہنچانے کے لیے وہ لگن نہیں تھی جس سے اِس میں نئی نئی باتیں پیدا ہوتیں اور یہ تمھارے ہاتھوں میں اور بھی جلدی پہنچ جاتا۔

اچھا، تو آؤ تمھیں آگے لے چلوں جہاں تم دیکھو گے کہ کچھ لوگوں نے پوری لگن کے ساتھ اِسے اپنا اصلی کام سمجھ کر کیا۔ اور ظاہر ہے اِس کا نتیجہ وہی ہونا تھا کہ میرا سفر جلدی طے ہوا۔

ڈاک کا بیوپار ــ ٹیکسی

وینس کا نام تم نے سُنا ہے؟ اب تو یہ اٹلی کا ایک بہت خوب صورت شہر ہے لیکن جس وقت کی میں بات کر رہا ہوں اُس وقت یہ خود چھوٹا سا آزاد ملک تھا۔ اِس میں ایک خاندان تھا جس کا نام تھا تاسّی۔ اسے بعض لوگ 'ٹیکسی' بھی کہتے تھے۔ پورے یوروپ میں اس کا نام 'ٹیکسی' ہی مشہور ہوا۔ اب تم آج کی 'ٹیکسی موٹروں' میں اِس نام کو گڈمڈ مت کر دینا۔ خیر، ہوا یہ کہ اِسی خاندان کے ایک صاحب کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ایک ایسی کمپنی کھولی جائے جس کا کام ہی خط پہنچانا ہو۔ ان صاحب کا نام تھا فرانزوان ٹیکسی۔ بس ۱۵۰۰ء میں انھوں نے ایک کمپنی کھول دی۔ جلدی ہی اس کمپنی کی ایک شاخ اس کے پڑوسی ملک اٹلی میں بھی کھل گئی، اور ایسی کھلی کہ آنے والے لگ بھگ دو سو سال تک پھولتی پھیلتی رہی۔ اور پھر آگے بڑھی تو فرانس اور جرمنی نے بھی اُسے اپنا لیا۔ شروع شروع میں تو یہی بات ہوئی کہ بادشاہوں نے عام آدمیوں کے خط لے جانے کی اجازت اس کمپنی کو نہ دی۔ لیکن عام آدمی کے خطوں سے زیادہ آمدنی ہوتی تھی۔ چنانچہ اِن کمپنیوں نے چُھپے چوری لوگوں کے خط پہنچانے شروع کر دیے، لیکن بعد میں یہ اجازت بھی مل گئی۔ فرانس میں شاید سب سے پہلے ۱۶۰۰ء میں ٹیکسی کمپنی کو ہر شخص کا خط لے جانے کی اجازت

دے دی گئی۔

اس کمپنی نے ڈاک کو صحیح طریقے پر چلایا، ریلے کا طریقہ اپنایا، اور ڈاک کے لیے گھوڑوں کو استعمال کیا۔ ان کا کام اتنا پھیلا کہ یہ صرف اپنے ملک کے اندر ہی ڈاک نہ پہنچاتیں بلکہ یوروپ کے لگ بھگ سارے ملکوں میں ان کا جال پھیلا ہوا تھا۔ ٹیکسی کمپنیوں کا سب سے اچھا وقت شاید سترھویں صدی کے شروع میں تھا۔ اس وقت اِن کے پاس کم سے کم بیس ہزار گھوڑ سوار تھے اور ایک ہزار میل کا سفر گرمیوں میں دس دن میں اور سردیوں میں بارہ دن میں پورا ہو جاتا تھا۔



تصویر ۱۲

وینس کے فرانز وان ٹیکسی

ٹیکسی کمپنیوں کے منافع کو دیکھ کر بہت سے ملکوں میں کچھ اور کمپنیوں نے بھی یہ کام شروع کیا۔ اِس سے فائدہ تو یہ ہوا کہ ایک دوسرے کے مقابلے میں یہ کمپنیاں اپنے کام کو اچھے سے اچھا کرنے کی کوشش کرتیں۔ چنانچہ اسی زمانے سے ڈاک گاڑیوں کے ذریعے لوگوں کا سامان بھی جانے لگا اور خود لوگ بھی انہی سے سفر کرنے لگے۔ یہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ آسانیاں دینے کی کوشش کرتیں۔ ڈاک

گاڑیاں بالکل صحیح وقت پر مقررہ چوکیوں یا اسٹیشنوں سے چھوٹتیں اور اپنی منزل پر صحیح وقت پر پہنچتیں لیکن ساتھ ہی اِن میں دشمنی بھی ہو جاتی اور کبھی کبھی یہ گاڑیاں راستے میں لوٹ لی جاتیں، اور ڈاک جلادی جاتی۔ پھر بھی ایسی کمپنیاں سارے یورپ اور امریکہ میں کام کرتی رہیں۔

یورپ میں اگلا زمانہ عام ترقی کا زمانہ ہے۔ اِس زمانے میں یہاں کے ملکوں میں بڑے بڑے بادشاہ، لکھنے پڑھنے والے، عالم، فاضل اور قابل لوگ پیدا ہوئے کتابیں چھپیں اور پڑھنے لکھنے کا چرچا بڑھا، صنعت اور تجارت بڑھی، اور یہ ساری باتیں میرے لیے بہت اچھی ہوتی ہیں۔ اب اور آسانی یہ بھی تھی کہ میدان پہلے سے تیار تھا۔ لوگ میری ضرورت اور میرے گنوں کو بھی سمجھ چکے تھے۔ بس اب تو کچھ لگن والے لوگوں کی ضرورت تھی جو میری اور تمہاری خدمت پر لگ جائیں۔ لیکن لوگوں کے دماغوں میں یہ بات جڑ پکڑتے پکڑتے بھی کئی سو سال لگ گئے کہ میری قیمت اتنی کم ہونی چاہیئے کہ ہر آدمی مجھ تک پہنچ سکے اور میں ہر آدمی تک پہنچ سکوں۔ ابھی تک تو ڈاک پہنچانے کا کام ایک بیوپار ہی تھا۔ کپڑا بننے کا کارخانہ نہ کھولا، کوئی بہت بڑی تجارت نہ کی ڈاک پہنچانے کا کام شروع کر دیا۔ اب جب بادشاہوں نے دیکھا کہ اِس کاروبار میں تو بہت فائدہ ہے۔ تو انھوں نے آہستہ آہستہ اِسے اپنے یا حکومت کے ہاتھوں میں لے لیا۔

میں پھر بادشاہوں کے دربار میں

بادشاہوں کا تجربہ تو میرے لیے کوئی نیا نہیں تھا۔ خود اِس وقت بھی یورپ کے علاوہ میں جہاں بھی تھا، بادشاہوں کے پاس ہی تھا۔ مگر میں وہاں زیادہ خوش نہیں تھا۔ اصل میں میں تو ہر شخص کی خدمت کے لیے بنا ہوں۔ اتنا ہی ایک غریب مزدور کے لیے جتنا ایک بادشاہ یا وزیر کے لیے۔

ہاں، تو میں کہہ رہا تھا کہ یورپ کے بادشاہوں نے بھی تجارتی کمپنیوں سے چھین کر اپنے ہاتھوں میں لینا شروع کر دیا۔ سب سے پہلے فرانس میں پوری ڈاک کے سلسلے کو حکومت نے خود سنبھالا۔ مگر مقصد وہی تھا کہ کسی طرح حکومت کی آمدنی بڑھے۔ فرانس کے بعد برطانیہ کی حکومت نے بھی یہی کیا۔ اور پھر یورپ کے دوسرے ملکوں میں بھی ڈاک حکومت کے ہاتھوں میں آتی چلی گئی۔

اور تم جانتے ہو کہ ہر نئے کام میں اچھائیاں اور بُرائیاں دونوں ہی ہوتی ہیں۔ اگر اس کے فائدے زیادہ ہوتے ہیں یا اس سے لوگوں کو آسانی زیادہ ہوتی ہے تو وہ نیا کام چل نکلتا ہے، اور وہ دنیا میں جم جاتا ہے، اور اگر نقصان زیادہ ہوں تو پھر وہ نہیں چل پاتا۔ اس کی ایک مثال یاد آئی۔ جب ۱۸۳۰ء میں برطانیہ میں پہلی بار ریل گاڑی چلی تو اس کی تیس میل فی گھنٹے کی رفتار سے لوگ بہت گھبرائے۔ عجیب عجیب سی جھوٹی افواہیں پھیلیں۔ کھیتی کی زمین خراب ہوئی۔ اس کی آواز سے لوگ سوتے سے چونک پڑے اور لوگوں نے اسے شیطانی سواری کا نام دیا۔ کچھ لوگوں کو شکایت تھی کہ انجن کی آواز سے اُن کی مرغیوں نے انڈے دینا چھوڑ دیے، اور نہ معلوم کیا کیا کچھ۔ مگر بعد میں کیا ہوا؟ آج دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا بڑا شہر ہو جہاں ریل گاڑی نہ چلتی ہو۔

میرے دوبارہ بادشاہوں کے پاس واپس لوٹنے سے بہت سے فائدے بھی ہوئے اور کچھ نقصان بھی۔ بادشاہ کے پاس بیوپاری کے مقابلے میں زیادہ طاقت ہوتی ہے۔ زیادہ پیسے ہوتے ہیں، وہ مجھے آسانی سے اور پکے ڈھنگ سے چلاتا ہے، اور ایسا ہوا بھی۔ اب گاڑیاں وقت پر چلتیں ڈاک وقت پر پہنچتی۔ بادشاہ کی ڈاک کی وجہ سے اس کی حفاظت بھی زیادہ ہوتی۔ لیکن تھوڑا سا نقصان بھی ضرور ہوا۔ بادشاہ کو تو صرف اپنے ملک والوں سے کام ہوتا ہے، اُسے دوسرے ملک میں عام لوگوں کے خط بھیجنے سے کیا فائدہ؟ چنانچہ آہستہ آہستہ ایک ملک سے دوسرے ملک میں ڈاک کا جانا بھی ختم ہوتا چلا گیا۔ لیکن خود ملک کے اندر ڈاک

بڑی پابندی سے آتی جاتی۔

شروع شروع میں تو ڈاک کا یہ نظام صرف ملک کے بڑے بڑے شہروں اور قصبوں میں ہی رہا۔ لیکن کسی شہر کے اندر خط نہیں آتے جاتے تھے۔ مگر بعد میں یہ کام بھی شروع ہوا، اور بڑی تیزی سے اس میں ترقی ہوئی۔ سب سے پہلے ۱۶۵۳ء میں پیرس شہر کے اندر ہی اندر ڈاک بانٹنے کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ پھر کوئی تیس سال بعد لندن نے بھی اسے اپنا لیا اور ایسی ترقی کی کہ ہر جگہ سے دن میں بارہ بار ڈاک جمع کی جاتی، اور لندن کے اندر ہی اندر صبح کے بھیجے ہوئے خط کا جواب شام تک آجاتا۔ گاؤں والے بے چارے خود جاکر اپنے خطوں کی پوچھ تاچھ کر لیتے تھے۔ بہت دن بعد کہیں ۱۸۶۳ء میں پہلی بار فرانس کے گاؤں والوں کو اُن کے خط گھر بیٹھے ملنے شروع ہوئے۔ مگر جلدی ہی یورپ کے سارے ملکوں نے اس طریقے کو بھی اپنا لیا۔

اِس وقت یعنی سترھویں اٹھارویں صدی میں یورپ کے ملکوں میں میرے سفر کی ہلکی سی جھلک کچھ ایسی تھی کہ اچھی سڑکوں پر بہت تیزی سے یعنی کوئی دس میل فی گھنٹے کی رفتار سے۔ دو یا چار گھوڑوں والی بڑی سی گاڑی دوڑتی جارہی ہے۔ اُس میں ڈاک کے تھیلے اور سامان رکھنے کی الگ جگہ ہے اور مسافروں کے بیٹھنے کی الگ۔ کوچبان کے ایک ہاتھ میں چمڑے کا ایک کوڑا ہے اور دوسرے میں سینگ کی ایک نفیری جسے وہ بار بار بجاتا جا رہا ہے۔ اِس کی آواز سنتے ہی لوگ اِس گاڑی کے گذرنے کے لیے فوراً رستہ صاف کر دیتے ہیں۔ یہ گاڑی صرف وہیں رکتی ہے جہاں گھوڑے بدلنے ہوتے ہیں یا پھر کوچبان وغیرہ اپنی ڈیوٹی بدلتے ہیں۔ گاڑی کے ساتھ ایک یا دو ہتھیار بند سپاہی بھی موجود ہیں۔ ڈاک کے تھیلے ایسے چھوٹے اسٹیشنوں یا چوکیوں پر بھی اتارے یا چڑھائے جاتے ہیں جہاں گاڑی نہیں رکتی۔

مہنگا خط

تو بھائی اِس زمانے کی ڈاک میں بس ایک بات ایسی بھی تھی۔ جسے میں اُس وقت کی خرابی کہہ سکتا ہوں۔ تم کہوگے کہ وہ دیر سے پہنچتی تھی نہیں بھائی! جتنی ترقی سواریوں میں دنیا نے کی تھی اِس لحاظ سے تو ڈاک بہت تیز سفر کرتی تھی۔ یہ خرابی تھی اِس کا سفر خرچ۔ ہاں خط بھیجنا اب بھی معمولی آدمی تو کیا اچھی خاصی آمدنی والے کے بھی بس کی بات نہیں تھی۔ کسی نے اگر لندن سے امریکہ تک صرف ایک کاغذ کا خط بھیج دیا تو سمجھ لو کہ آج کے حساب سے اُس کے کوئی ساڑھے آٹھ روپے لگ گئے۔

سروالٹر اسکاٹ برطانیہ کے ایک بہت بڑے شاعر اور ناول لکھنے والے تھے۔ ایک بار اِن کے کسی شاگرد نے اپنا ایک ڈرامہ پڑھنے کے لیے اِن کے پاس بھیج دیا۔ معلوم ہے ان بے چارے کو کتنے پیسے دینے پڑے تھے۔ اس خط کو لیتے وقت: پانچ پاؤنڈ۔ آج کی قیمت کے مطابق کوئی سَو روپیے۔ شاگرد بھی اتنا عزیز تھا کہ اُس نے ایک ہی ہفتے بعد ایک اور ڈرامہ دیکھنے کے لیے اِن کے پاس بھیج دیا۔

ایک بوڑھی عورت کے پاس اس کے بیٹے نے کہیں سے خط بھیجا۔ بیچاری کے پاس پیسے نہیں تھے کہ اُسے لے لیتی۔ اس نے کئی ہفتے تک اپنے کھانے کے پیسوں میں سے پیسے بچائے۔ اللہ کے ایک نیک بندے نے اس کی کچھ مدد بھی کی، اور وہ خط لینے ڈاک خانے پہنچی۔ سوچو یہ جان کر اُس کے دل پر کیا گذری ہوگی، کہ چونکہ اُس خط کا لینے والا کوئی نہیں تھا، اِس لیے اُسے ضائع کیا جاچکا تھا۔

ایک شخص صرف اِس لیے اپنی پیاری بیٹی کا خط ڈاک خانے سے نہ لے سکا کہ اگر وہ آج کی قیمت میں استی پیسے دیتا تو اسے اپنے دوسرے بچوں کا

کھانا کم کرنا پڑتا۔ جب ایسے بہت سے قصے مجھے اپنی پوری زندگی میں یاد آتے ہیں تو بڑا افسوس ہوتا ہے کہ میری وجہ سے بھی لوگوں کو تکلیف ہوئی ہے جب کہ میں صرف اِس لیے بنا ہوں کہ لوگوں کو مجھ سے زیادہ سے زیادہ آسانی مل سکے۔

میری اتنی اونچی قیمت کی وجہ سے خود ڈاک خانوں کو بھی نقصان ہوتا تھا۔ بہت سے لوگوں نے بے ایمانی کرنی شروع کر دی۔ کچھ لوگ یہ ترکیب کرتے کہ خط پر پتے کے ساتھ ضروری باتیں بھی لکھ دیتے۔ شاید اسی بے ایمانی کو روکنے کے لیے شروع میں پتے کے حصے پر یہ لکھا جاتا تھا "یہاں صرف پتہ لکھیے" مگر یہ دستور آج بھی تھوڑا بہت چلا آ رہا ہے۔ اپنے آج کے پوسٹ کارڈ کو اٹھا کر دیکھو، پتے کے حصے پر اوپر ہی لکھا ہوا ہے "صرف پتہ" ویسے یہ بات تو اس لیے بھی اچھی ہے کہ اگر خط کا مضمون پتے کے ساتھ نہ ہو تو پتہ پڑھنے اور خط کے چھانٹنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اِس بے ایمانی کے علاوہ کبھی کبھی ڈاکیے بلکہ خود ڈاک خانے کے پوسٹ ماسٹر صاحب بھی بے ایمانی کر جاتے تھے۔ اپنے جاننے والوں کا خط انہیں پڑھوا دیا، اور پھر کہہ دیا کہ اِس پتے پر کوئی آدمی تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ چلیے صاحب خط بھی پڑھا گیا اور ڈاک خانے کو پیسے بھی نہ ملے۔ یہ بے ایمانیاں صرف اِس لیے تھیں کہ خط کی قیمت بہت زیادہ تھی۔

اِس کے علاوہ دو ہی خرابیاں اور بھی تھیں اُس وقت کی ڈاک میں۔ پہلی خرابی تو وہی تھی کہ پیسے خط بھیجنے والے کو نہیں بلکہ جسے خط لکھا گیا ہے اُسے دینے ہوتے تھے۔ اب اگر جسے خط لکھا گیا ہے وہ کہیں چلا گیا، مر گیا، یا خط لینے سے انکار کر دیا تو پیسے کا بھی نقصان ہوا اور اس کے لانے کی محنت بھی بے کار گئی۔ دوسری خرابی بھی تھوڑی بہت تم جانتے ہو۔ خط جتنی دور سے آتا تھا اتنے ہی اُس کے پیسے زیادہ لگتے تھے۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ دور کے علاقوں سے لوگ خط بھیجتے ہوئے گھبراتے ہوں گے، اور بھیجنے والا گھبرائے یا نہ گھبرائے کم سے کم خط لینے والا تو پہلے اچھی طرح سے یہ دیکھ لیتا ہو گا کہ خط چلا کہاں سے ہے۔ قریب سے آنے والے

خط تو لوگ آسانی سے لے لیتے ہوں گے، مگر دُور دُور سے آئے ہوئے خط، جن میں وقت بھی زیادہ لگا اور خرچ بھی زیادہ ہوا، اُسے لوگ کافی جھک جھک کے بعد لیتے ہوں گے۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ کسی غریب آدمی کے گھر میں تو یہ خبر ہی پریشانی پیدا کر دیتی ہو گی کہ اُس کا کوئی خط ڈاک خانے میں آیا ہے۔

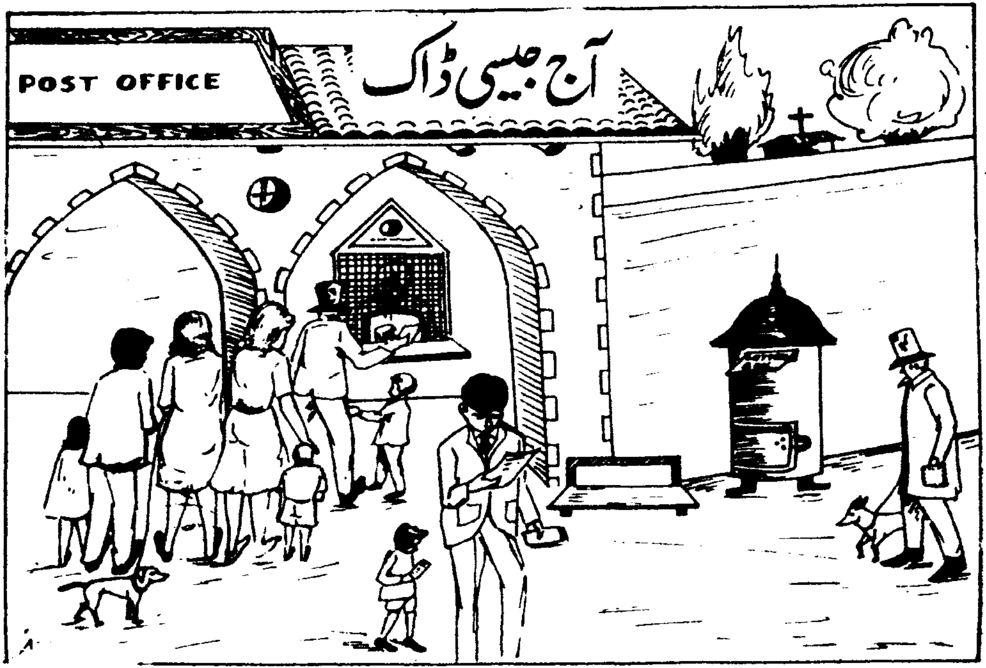
پھر اِس پورے طریقے میں یورپ میں ایک اور خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ بہت سے لوگوں کے خط مفت لائے جاتے تھے۔ بعض بعض جگہ سرکاری افسروں، شاہی خاندان کے لوگوں، پارلیمنٹ کے ممبروں اور ایسے بہت سے لوگوں کے خط مفت جاتے تھے۔ جب اٹھارویں صدی کے آخر میں فرانس میں اِس کی چھان بین کی گئی تو معلوم ہوا کہ یہاں ہر تین خطوں میں سے دو خط مفت جاتے ہیں۔ ب سے پہلے فرانس میں ہی اس لعنت کو بھی ختم کیا گیا، اور آہستہ آہستہ ہ ہوں سے مفت خط لے جانے کو بالکل بند کر دیا گیا۔

کہانی کے اِس حصّے کو ختم کرنے سے پہلے بس ایک بات یہ اور تمھیں بتا دوں کہ میرے سفر میں اتنی آسانیاں زیادہ تر یورپ کے ملکوں اور امریکا میں ہی پیدا ہوئی تھیں۔ باقی تمام دنیا ابھی بہت پیچھے تھی بلکہ یوں کہوں کہ دنیا کے اور حصّوں میں عام آدمی کو ابھی اِس طرح خط ملنے ہی شروع نہیں ہوئے تھے، جس طرح یورپ اور امریکا میں مل جاتے تھے۔ اِس کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ اِس زمانے میں افریقہ اور ایشیا کے بہت سے ملکوں پر یورپ کے ملکوں کا ہی راج تھا۔ وہ اِن ملکوں میں جو کچھ بھی کرتے تھے وہ صرف اِس لیے اور صرف اتنا کہ جس سے خود اُن کے راج کرنے میں آسانی ہو جائے۔ بہت سی جگہوں پر تو لوگ بھی بہت زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے۔ عام آدمی کو خط بھیجنے کی اتنی ضرورت بھی نہ پڑتی تھی کہ وہ نئے نئے راستے تلاش کرنے کی کوشش کرتا۔

اچھا بھائی، تو مجھے تمھیں اب یہ سنانا ہے کہ یہ آج کی ڈاک کا نظام کیسے

آگیا۔؟ خط اتنے سستے کیسے ہو گئے ؟ اب خطوں کی قیمت اُس کے سفر کے مطابق کیوں نہیں لی جاتی۔؟ وغیرہ وغیرہ۔

ہوا یہ کہ جب خطوں کی قیمت بہت بڑھی۔ اتنی کہ معمولی کیا اچھی خاصی آمدنی والے آدمی کو بھی خط وصول کرنا مشکل ہو گیا تو کچھ لوگوں کو اپنے دوستوں سے کہنا پڑا کہ ’بھائی، مت بھیجا کرو خط۔! چنانچہ شروع شروع میں تو یہ بات دو چار آدمیوں نے ہی کی لیکن کچھ دِن بعد ہر جگہ بہت سے لوگ خط لینے اور بھیجنے سے بچنے لگے۔ بس اُسی وقت خط بھیجتے جب بالکل مجبوری آجاتی یا خط بھیجے بغیر کام ہی نہ چلتا۔ دوسری طرف مفت خط بھیجنے کی لعنت بھی باقی تھی چنانچہ برطانیہ کی حکومت نے دیکھا کہ ۱۸۴۲ء میں ڈاک کے ذریعے اُسے اتنی آمدنی بھی نہیں ہوئی جتنی بیس سال پہلے ہو جاتی تھی۔ اب تو حکومت کو بڑی پریشانی ہوئی۔ یہ تو کام ہی سارا اِس بنیاد پر چل رہا تھا کہ حکومت اس سے پیسے کمانا چاہتی تھی کچھ ایسا لگا جیسے پوری عمارت کی بنیاد کی اینٹ ہی کھسک رہی ہو۔ دوسری طرف لوگ الگ پریشان تھے۔ خط کی عادت پڑ چکی تھی خط کی آسانیوں کا مزہ چکھ چکے تھے۔ اب اُسے چھوڑیں کیسے ؟ اور اگر نہیں چھوڑتے تو اتنے مہنگے خط لیں کیسے۔ ؟

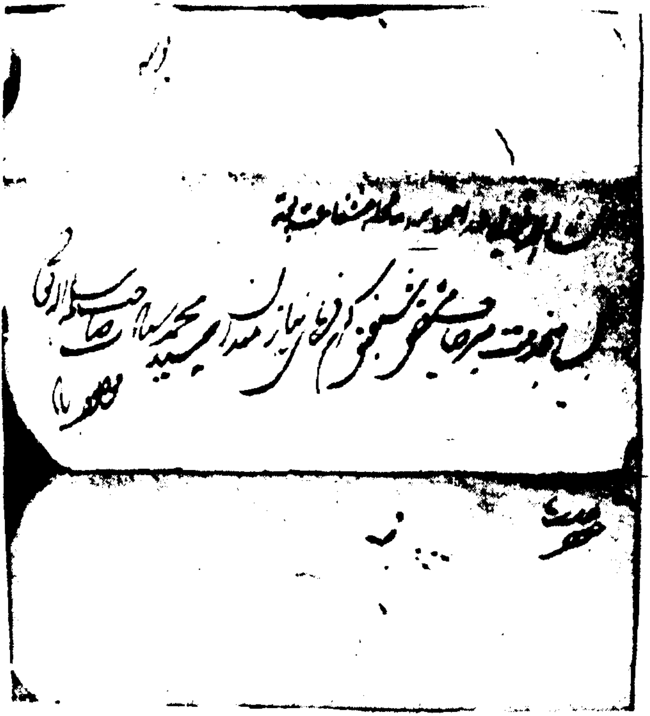

POST OFFICE
آج جیسی ڈاک

سستے خط

اچھا اب میں ایک ایسے آدمی کے متعلق تمھیں بتاؤ جس کا مجھ پر بڑا احسان ہے، اور اگر مجھ پر احسان ہے تو پھر ہر اُس آدمی پر بھی احسان ہے جو خط بھیجتا ہے اور خط پاتا ہے۔ یہ بات کہنا بھی غلط نہیں ہوگا کہ آج کی دنیا کی ڈاک کا اتنا بڑا نظام اصل میں اُسی ایک آدمی کی دین ہے۔ اِس نیک آدمی کا نام تھا رالینڈ ہِل۔ رالینڈ ہِل برطانیہ کے ایک چھوٹے سے شہر میں ۱۷۹۵ء میں پیدا ہوئے تھے۔ پڑھ لکھ کر یہ ایک اسکول میں استاد ہوگئے۔ اِن کو نہ معلوم کیسے ڈاک اور اُس کے نظام سے لگاؤ پیدا ہوگیا۔ اُس وقت برطانیہ کی ڈاک کا نظام بہت خراب تھا۔ یہ حال تم ابھی سُن ہی چکے ہو۔ جب ہل صاحب کوئی چالیس سال کے ہوئے تو انہوں نے ڈاک پر ایک کتاب لکھی، اور اِس میں بڑی سچائی اور صفائی سے اُس وقت کی ڈاک میں جتنی بھی خرابیاں تھیں وہ گنائیں۔ خطوں کو پہنچانے کی قیمت روز بروز بڑھ رہی تھی، لیکن دوسری طرف حکومت کی آمدنی روز بروز گھٹتی جا رہی تھی۔ سارا کا سارا نظام خراب ہو رہا تھا۔ مفت خطوں کی تعداد بھی بڑھ رہی تھی۔ اِن تمام باتوں کو ہل صاحب نے پورے ثبوت اور حکومت کے حساب کے ساتھ ثابت کیا۔ لیکن اِس کے علاوہ جو خاص بات ہل صاحب نے اپنی کتاب میں لکھی وہ ایسی تھی کہ شروع میں اس کا کسی کو یقین ہی نہیں آسکتا تھا۔ انھوں نے کہا کہ خط چاہے کتنی دُور بھی سفر کرے اُس کا اُس کی قیمت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ کیوں، ہے نا عجیب بات؟! ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ کوئی چیز کسی سواری پر سفر بھی کرے، سواری میں پیسے

بھی خرچ ہوں ، اور اُس چیز کا تعلق اُس کی قیمت سے نہ ہو! اصل میں ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ اگر بہت سے خط ایک ساتھ سفر کریں تو ایک خط کے سفر پر اتنا کم خرچ آتا ہے کہ اس کا ناپنا بھی مشکل ہے۔ انھوں نے سال بھر میں جانے والے سارے خطوں کا حساب کیا، اِن خطوں نے کتنی دور سفر کیا اور اُس پر کتنا پیسہ خرچ ہوا اِس کا حساب کیا اور آخر میں یہ بتلایا کہ اگر کوئی خط چارسو میل دور سفر کرتا ہے تو اس پر ایک پینی کا صرف چھتیسواں حصّہ (یعنی آج کے پیسوں میں کوئی ½ پیسہ) خرچ ہوتا ہے۔ جبکہ اُس زمانے میں اِسی خط کے ساڑھے نو پینس (یعنی کوئی ۱، پیسے) لیے جاتے تھے۔

اِس بات کو ذرا اور آسانی سے سمجھنے کے لیے تمھیں تھوڑی دیر رُک کر یہ دیکھنا پڑے گا کہ اُس وقت خط بھیجنے والے کے ہاتھوں سے چل کر خط لینے والے کے ہاتھوں میں پہنچنے تک اِس کے لیے کیا کیا کام کیے جاتے تھے۔ سمجھو کہ رشید صاحب نے دلی سے کلکتے میں نرائن صاحب کو خط لکھ کر اپنے قریب کے ڈاک خانے کے منشی کو دیا، منشی جی نے اُس کاغذ کو غور سے دیکھا، جو دو تین مرتبہ موڑ کر چپکا دیا گیا تھا "کیوں صاحب! اِس میں کوئی پرچہ ورچہ تو نہیں رکھ دیا آپ نے ؟" رشید صاحب نے تنک کر جواب دیا "صاحب آپ نے بے ایمان سمجھا ہے ہمیں!" منشی جی چپ ہو گئے اور اپنا رجسٹر کھولا، اُس میں رشید صاحب کا پتہ لکھا، پھر نرائن صاحب کا کلکتے کا پتہ لکھا، کچھ ٹیڑھی سیدھی لکیروں میں خط پر بھی کچھ لکھا ، اور خط کو کلکتے جانے والے خطوں کے تھیلے میں ڈال دیا۔ اب سفر تو بہت لمبا ہے، تم کہاں کہاں میرے ساتھ پھرو گے، بس اتنا بتا دوں کہ جس بڑے شہر میں ڈاک رُکی، کچھ تھیلے اتار کر کچھ اور چڑھائے گئے۔ وہاں کے منشیوں نے اپنے رجسٹروں پر اِن تھیلوں کی کچھ لکھا پڑھی کی۔ شکر ہے کہ ہر خط کے متعلق ہر جگہ رجسٹروں پر نہیں لکھا جاتا تھا، صرف تھیلوں کے بارے میں ہی لکھا جاتا ہے۔ ورنہ جب تک یہ خط کلکتے پہنچتا رشید صاحب اور نرائن صاحب دونوں ہی اللہ کو



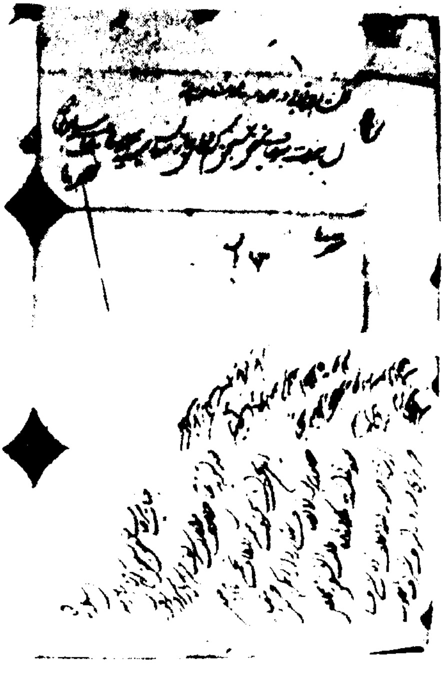
تصویر نمبر ۲

آج کے اِن لینڈ لیٹر سے ملتا جلتا ایک بہت پرانا خط۔

لفافہ کھول لیا گیا ہے۔ اوپر کے حصے میں ڈاک کا خرچ آدھ پیسہ لکھا ہوا ہے۔

پتہ:۔ انشاء اللہ تعالیٰ در امروہہ محلہ شفاعت پوتہ۔ بسامیخدمت میر صاحب مشفق شفیق کرم فرمائے

نیازمندان سید محمد سیادت صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ موصول باد۔ (بشکریہ مولوی سید محمد عبادت صاحب امروہہ)



تصویر نمبر ۳

آج کے ان لینڈ لیٹر، جیسے بہت پرانے خط کی تصویر جس میں پتہ اور خط دونوں ساتھ ہیں۔

(بشکریہ مولوی سید محمد عبادت صاحب۔ امروہہ)

بھارے ہو گئے ہوتے۔ خیر، وہ خط کلکتے کے بڑے ڈاک خانے میں پہنچا۔ یہاں بھی پہلے ہر خط کو رجسٹر پر چڑھایا گیا۔ پھر ایک فہرست کے ساتھ کلکتے کے چھوٹے ڈاک خانے کو بھیجا گیا، وہاں بھی اُسے رجسٹروں پر چڑھایا گیا، خوب اچھی طرح جانچ پڑتال کی گئی۔ کئی کئی موم بتیوں کی روشنی میں غور سے دیکھا گیا۔ یہ جاننے کے لیے کہ اُس میں سچ مچ کوئی اور پرچہ تو رکھا ہوا نہیں ہے۔ بھاری خطوں میں شبہ ہوا تو انھیں تولا بھی گیا۔ یہ بھی یاد رکھنا کہ اُس زمانے میں آج کی طرح لفافے نہیں تھے۔ صرف لمبے لمبے کاغذ موڑ کر چپکا دیے جاتے تھے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر خط کئی صفحوں میں ہے تو وہ کئی خط ہیں جن کو آپس میں نتھی کر دیا گیا ہے۔ چلیے صاحب ڈاکیے کو خط دیے گئے اور ایک لمبی سی فہرست دی گئی جس میں بھیجنے والے کا نام اور پتہ، خط پانے والے کا نام اور پتہ، خطوں کی تعداد، کتنی دور سے آیا ہے وہ فاصلہ پھر اُس کے کتنے پیسے لیے جانے ہیں اور نہ معلوم کیا کیا کچھ لکھا ہوا ہے۔ اب ڈاکیا چلا۔ ظاہر ہے کہ آبادی اور آبادی میں گلیاں اور مکان بھی اتنی اچھی طرح نہیں بنے تھے جیسے بڑے بڑے شہروں میں آج تمھیں نظر آتے ہیں۔ نہ معلوم کتنی دیر میں ڈاکیے نے نرائن صاحب کا گھر ڈھونڈا۔ اگر وہ اُسی وقت مل گئے تب تو خیر ڈاکیے کی منزل بھی آسان ہو گئی، ورنہ اُسے پھر آنا پڑے گا۔ نرائن صاحب تو پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ رشید صاحب اُن کے بڑے اچھے دوست ہیں، اِس لیے انھوں نے خوشی سے پیسے دیے اور خط لے لیا، ورنہ اگر خط پانے والا کوئی اَن پڑھ ہے تو ڈاکیے کے ساتھ جھک جھک بھی ہو رہی ہے، پیسوں کی زیادتی کی شکایت بھی ہے۔ ممکن ہے وہ خط لینے سے ہی انکار کر دے۔ اب تم نے دیکھا کہ کتنا مشکل طریقہ تھا میرے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنے کا۔!

بس یہی سب کچھ دیکھ کر ہل صاحب نے کہا تھا کہ اصل میں خرچ ان بیکار کاموں پر زیادہ ہوتا ہے جن کا خط کے آنے جانے سے کوئی تعلق نہیں ہے سفر کا خرچ تو بیکار میں بدنام ہے۔ چنانچہ انھوں نے کہا کہ اگر غریب ڈاکیے کو یہ سب

کام کرنے ہوں تو وہ ڈیڑھ گھنٹے میں صرف ستر کے قریب خط بانٹ پاتا ہے۔ دوسری طرف اگر اسے خطوں کو صرف لوگوں کے دروازے میں ڈال دینے کا کام ہی دیا جائے تو وہ صرف آدھے گھنٹے میں ۵۰۰ خط بانٹ سکتا ہے۔

اب جو بات ہل صاحب نے لکھی وہ میری زندگی کی سب سے اچھی بات تھی اور اتنی ہی اچھی تمہارے لیے یعنی عام آدمی کے لیے۔ اُن کا کہنا تھا کہ خط کی قیمت اتنی کم کردی جائے کہ غریب سے غریب آدمی بھی خط بھیجتے ہوئے نہ گھبرائے۔ اس کی وجہ سے بہت سے خط آنے جانے لگیں گے، اور آمدنی بھی کم نہیں ہوگی۔ بلکہ بڑھے گی۔

ہل صاحب یہ بات تو پہلے ہی کہہ چکے تھے کہ خط کی قیمت اس کے سفر کی لمبائی سے نہیں ناپی جانی چاہیے بلکہ اُس کے وزن سے ناپی جانی چاہیے۔ مگر ہاں، ذرا یاد کرو کہ آج بھی تو تم کچھ خط ایسے بھیجتے ہو جس کی قیمت تم اس کے سفر کی دوری سے ناپتے ہو۔ جیسے اگر تم لنکا، برما یا پاکستان میں کسی کو خط بھیجو تو جتنے پیسے اِس خط میں لگیں گے اُس سے زیادہ اُس خط میں لگیں گے جو تم لندن یا امریکہ میں اپنے کسی دوست کو بھیجتے ہو۔ اب بھائی میں کیا کہوں یہ تو تمہارے ملکوں کے اصول ہیں۔ مجھے اس پابندی سے تم نے اپنے ملک میں تو آزاد کر دیا ہے لیکن دوسرے ملکوں کے سفر میں آزاد نہیں کیا۔ میں تو خیر یہی چاہتا ہوں کہ دوسرے ملکوں کے لیے بھی اتنا ہی سستا کر دیا جاؤں کہ جو شخص جہاں چاہے خط لکھے، اور کم سے کم اُس کی قیمت کی وجہ سے اُسے پریشانی نہ ہو۔ اچھا چلو آگے دیکھیں کہ ہل صاحب نے کیا کہا تھا۔

اُن کی اگلی بات پہلی دو باتوں کے مان لینے کے بعد ہی پوری ہوسکتی تھی، اور وہ یہ تھی کہ خط کی قیمت بھیجنے والا ادا کرے، لینے والا نہیں۔ جب بھیجنے والے کو یہ پتہ ہے کہ خط بہت سستا ہے اور اگر وہ خدانخواستہ کھو بھی گیا تب بھی کم سے کم پیسے کے لحاظ سے تو اُسے کوئی بہت بڑا نقصان نہ ہوگا تو وہ آسانی سے اس کی قیمت

چکانے کے لیے تیار ہو جائے گا۔

اب اگر تم ذرا سا بھی دھیان لگاؤ تو تمھاری سمجھ میں آ جائے گا کہ اِس طریقے میں کتنی آسانیاں ہیں۔ نہ رجسٹروں میں لکھنے کا جھنجھٹ ہے نہ دوری کے حساب لگانے کی پریشانی ہے۔ ڈاکیے کے لیے خود اُن صاحب کو بھی ڈھونڈھ لینا ضروری نہیں ہے جن کے نام خط بھیجا گیا ہے۔ اگر اُن کے گھر میں تالا بھی لگا ہے تو وہ خط ڈال کر آگے جا سکتا ہے چونکہ خط کے پیسے تو پہلے ہی دیے جا چکے ہیں۔ اور ایسی ہی کتنی آسانیاں ہیں اس طریقے میں۔

میں تو ہِل صاحب کا بڑا احسان مانتا ہوں کہ انھوں نے خوب سوچ سمجھ کر اتنی اچھی بات نکالی جس سے پوری دنیا کو اتنا فائدہ پہنچا مگر تمھاری دنیا والے ہر نئی بات کو چاہے وہ کتنی بھی اچھی یا کتنا بھی فائدہ پہنچانے والی کیوں نہ ہو ایک دم نہیں مان لیتے۔ ایسا ہی اِس بات کے ساتھ بھی ہوا۔ برطانیہ میں کچھ لوگ اِن کے ساتھی ہو گئے، جو یہ کہتے تھے کہ ہِل صاحب کا بتایا ہوا طریقہ بہت اچھا ہے۔ اسی طرح کچھ لوگ، جو پُرانے طریقے کو چھوڑ دینے کے لیے تیار نہیں تھے، وہ اِن کے مخالف ہو گئے۔ گھروں میں خوب زور کی بحثیں ہوتی تھیں۔ معمولی مزدور اور غریب آدمی کو یہ بات بہت اچھی لگتی تھی، چونکہ اِس میں اُسی کا سب سے زیادہ فائدہ تھا۔ لیکن کچھ پیسے والے ایسے بھی تھے جو صرف اِس لیے ناراض تھے کہ وہ ایسا خط نہیں لینا چاہتے تھے جس کے پیسے کسی دوسرے نے دیے ہوں۔ حکومت کے افسر کہتے تھے کہ چاہے خط کی قیمت کتنی بھی کم کر دی جائے لوگ اِسے بہت زیادہ نہیں خریدیں گے۔ اور اس طرح حکومت کو نقصان ہوگا۔ لیکن ایک بات بہت اچھی تھی۔ وہ یہ کہ اُس وقت برطانیہ میں جتنے اخبار نکلتے تھے انھوں نے اِس طریقے کا خوب ساتھ دیا۔ خوب بہت سے مضمون لوگوں نے اخباروں میں لکھے جن میں ہِل صاحب کے اس نئے طریقے کی حمایت کی گئی تھی۔ بڑے بڑے جلسے بھی ہوئے۔

اصل میں بات یہ تھی کہ اِس طریقے کے شروع کرنے سے ایک بہت بڑے

اصول کو توڑا جا رہا تھا۔ اب تک ڈاک صرف اِس لیے چلتی تھی کہ اِس سے حکومت کو پیسے کمانے ہوتے تھے، اور اب یہ کہا جا رہا تھا کہ ڈاک کا اصلی مقصد پیسہ کمانا نہیں بلکہ جنتا کی خدمت کرنا ہے اور اُس کی ضرورت پورا کرتا ہے۔ پھر اِس کے ساتھ ہی ساتھ پورے ڈاک خانے کے نظام کو بھی پوری طرح بدلنا ضروری تھا۔ اب تک صرف ایک کاغذ کا خط جاتا تھا۔ آپ کا جی چاہے تو ایک کاغذ اپنے گھر سے ہی لے لیجیے اور اُس پر خط لکھ دیجیے۔ ہِل صاحب کا کہنا تھا کہ اصل میں ڈاکخانے کو ہی ڈاک کا سامان بھی بیچنا چاہیے۔ لفافے ہوں، خط کے کاغذ ہوں، ٹکٹ ہوں؟ تاکہ اَن پڑھ آدمی کو بھی آسانی ہو جائے — اب تم جانو تم لوگ اتنی بہت سی تبدیلیاں ایک دم قبول کر لینے کے لیے آسانی سے تیار نہیں ہو جاتے بس اِسی لیے اِس کی مخالفت بھی ہو رہی تھی۔

جانتے ہو اِس پر انگلینڈ میں کتنے دن بحثیں ہوئیں۔ ؟ پورے دو سال۔ اور آخر میں برطانیہ کی پارلیمنٹ نے، لوگوں کی رائے سے مجبور ہو کر ۱۸۳۹ء میں اِس طریقے کو منظور کر ہی لیا۔

عام آدمی کا خط

آج ۱۰ر جنوری ۱۸۴۰ء کا وہ مبارک دِن ہے جب لندن میں میری قیمت صرف ایک پینی (کوئی ساڑھے سات پیسے) کر دی گئی ہے۔ آؤ چلو میرے ساتھ۔ آج میں تمھیں لندن کے ڈاکخانوں کی سیر کراؤں۔ معلوم ہوتا ہے۔ آج کوئی تیوہار ہے۔ عورتیں مرد، بوڑھے، جوان، اچھے اچھے کپڑے پہنے ہر طرف سے ڈاکخانوں کی طرف چلے آرہے ہیں۔ بچّوں کی سمجھ میں تو نہیں آرہا کہ آج یہ کیسا تیوہار ہے۔ لیکن چونکہ اُن کے بزرگ خوشی خوشی ایک جگہ جمع ہو رہے ہیں اس لیے وہ بھی خوش ہیں — وہ دیکھو ڈاکخانے کی ایک کھڑکی پر لوگوں کی اتنی لمبی لائن لگ گئی ہے کہ یہ سب تو اگر

شام تک بھی کھڑے رہیں تو خط نہیں خرید سکتے۔ اے لو، وہ ایک اور کھڑکی کھل گئی۔ یہ تو بہت اچھا کیا، ڈاکخانے والوں نے کہ ایک کھڑکی پر خط اور بیچنے شروع کر دیے۔ اور اگر تم شام تک ٹھہرو تو دیکھو گے کہ ڈاکخانے کی بہت سی کھڑکیوں پر صرف لفافے اور ٹکٹ ہی بیچے جا رہے ہیں۔ لوگ خط خرید رہے ہیں، انھیں خوب غور سے دیکھ بھی رہے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ خط پہنچ ہی نہیں سکتے۔ لیکن پھر بھی انھوں نے خط خرید ضرور لیا ہے۔ چونکہ ایک پینی (۱/۲ پیسے) خرچ کرنے میں جاتا ہی کیا ہے! آج شام کو جب ڈاکخانوں میں حساب لگایا گیا تو معلوم ہوا کہ صرف لندن میں ایک لاکھ بارہ ہزار خط لکھ کر ڈالے گئے جبکہ اس سے پہلے ایک دن میں اِس کے ایک تہائی خط بھی نہیں لکھے جاتے تھے۔

آج ہی وہ دِن بھی ہے جب دنیا میں سب سے پہلا ڈاک کا ٹکٹ چلا ہے۔ انگلستان کی ملکہ وکٹوریہ کا چہرہ کالے رنگ میں اِس ٹکٹ پر چھپا ہے۔ لوگ ٹکٹوں کو بڑے غور سے دیکھ رہے ہیں۔ کچھ لوگوں کو یہ طریقہ پسند آیا، کچھ کو طریقہ تو پسند ہے مگر یہ ٹکٹ اچھے نہیں لگتے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کو تھوک لگا کر ٹکٹ چپکانا گندگی لگتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اِس ٹکٹ پر ملکہ وکٹوریہ کی تصویر چھاپ کر خود ملکہ کی بے عزتی کی گئی ہے۔

اِن ٹکٹوں کے چلنے کے کچھ دِن بعد کسی اسکول کے ایک بچے نے اپنی بہن کو خط میں لکھا تھا:۔

> ”تم نے کبھی کسی لفافے پر ٹکٹ چپکایا ہے؟ میں تو کہتا ہوں کہ یہ ٹکٹ چپکانا بڑی حماقت اور بڑی پریشانی کا کام ہے کم از کم مجھے تو اپنے منھ کو گوند دانی بنانے میں کچھ مزہ آتا نہیں ہے۔ ہاں، ایک بات ضرور ہے۔ وہ یہ کہ تمھیں ملکہ معظمہ کی پشت کو پیار کرنے بلکہ اُسے اپنے تھوک سے بھگونے کا موقع مل جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ موجودہ وزارت کو شاید ملکہ معظمہ کی بے عزتی کرنے کا اِس سے اچھا طریقہ کوئی

اور نہیں رہ سکتا تھا۔"

لیکن پھر بھی زیادہ لوگوں نے اِس ٹکٹ کو پسند کیا اور یہ ٹکٹ کا طریقہ کچھ ایسا چلا کہ تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ ہر ملک میں آج تک ویسا ہی چلا آرہا ہے۔

شروع شروع میں برطانیہ میں سرکاری افسروں کی کچھ گڑبڑ سے کچھ دن کے لیے ڈاک کے اِس طریقے میں تھوڑی بہت رکاوٹ سی پیدا ہوتی نظر آئی۔ بعض رئیسوں کو ایک پینی کا ٹکٹ چپکا کر خط بھیجتے شرم آئی انھوں نے بہت بہت قیمت کے ٹکٹ چپکائے۔ کچھ لوگ اب بھی پرانے طریقے پر بغیر ٹکٹ چپکائے ہی خط بھیجتے تھے۔ لیکن کچھ سال بعد یہ نظام ٹھیک ہوگیا، اور ہِل صاحب کا یہ کہنا بھی ٹھیک ثابت ہوگیا کہ حکومت کی آمدنی کم نہیں ہوگی۔

بس اب آگے بڑھنے سے پہلے میں اپنے اِن اچھے دوست رالینڈ ہِل صاحب کے بارے میں کچھ اور بتا دوں: برطانیہ کی حکومت نے اور خاص طور پر وہاں کے غریب لوگوں نے انھیں بڑی عزت دی۔ یہ اپنی باقی ساری زندگی ڈاک کے دفتر میں پوری محنت اور لگن سے کام کرتے رہے اور اِسے اچھے سے اچھا بنانے کی کوشش کرتے رہے۔ عام لوگوں میں تو اِن کی شہرت اور عزت کا یہ حال تھا کہ لوگ اِن کی صورت دیکھنے کو ترستے تھے۔

ایک مرتبہ وہ اپنا ایک کوٹ سلوانے کے لیے ایک درزی کے پاس گئے، جب درزی کو معلوم ہوا کہ یہی ہِل صاحب ہیں تو اُس نے کوٹ کی سلائی کے پیسے لینے سے انکار کردیا۔ ہِل صاحب نے بہت پیسے دینے چاہے مگر اُس نے یہی کہہ کر نہ لیے کہ آپ نے تو میرے اور میرے بچّوں کے اتنے پیسے بچا دیے ہیں کہ ان میں ایک کیا کئی کوٹوں کی سلائی کی قیمت نکل آئے گی۔ ہر روز ہِل صاحب کے پاس شکریے کے بہت سے خط پہنچتے رہتے تھے۔

خیر بھائی، یہ بات بھی غلط نہیں ہے کہ ہِل صاحب کے احسانات بھی اتنے ہیں کہ شاید کوئی اور اُن کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ آج کی ڈاک کے طریقے میں جتنی



تصویر نمبر ۴

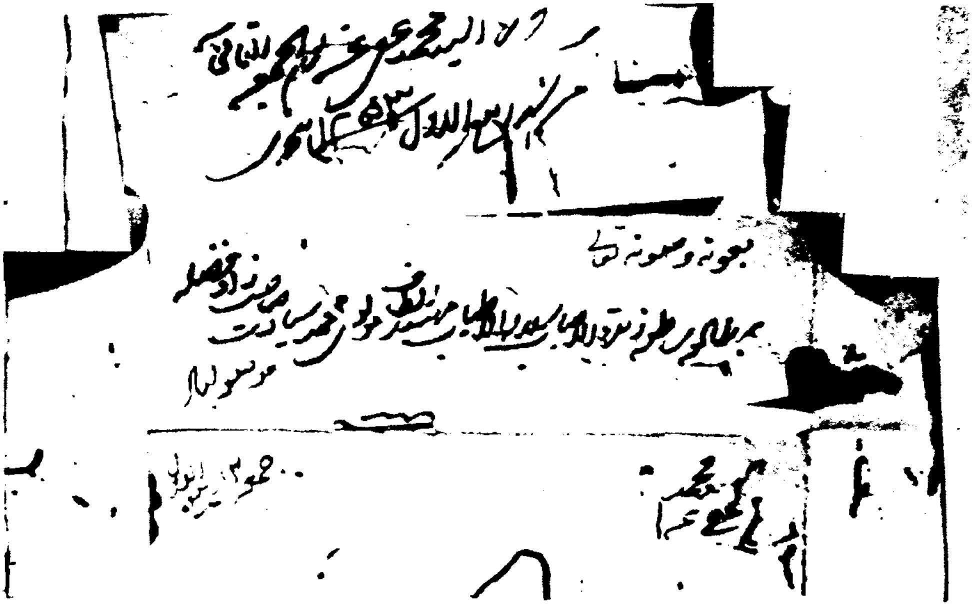
رالینڈ ہل

بھی بڑی بڑی باتیں ہیں سب انہی کی دی ہوئی ہیں ۔ بس اِس کے بعد یہ ہوا کہ یورپ کے ہر ملک نے یہ طریقہ اپنانا شروع کر دیا ، اور صرف بیس سال کے عرصے میں ہر جگہ یہی نظام چلنے لگا ، اور پھر یورپ ہی کیا دنیا میں ہر جگہ اِسی طریقے کو اپنا لیا گیا ۔ بس جیسے جیسے دنیا کے اور کاموں میں ترقی ہوتی گئی ویسے ویسے ڈاک بھیجنے میں بھی آسانی ہوتی گئی ۔

میری سواریاں

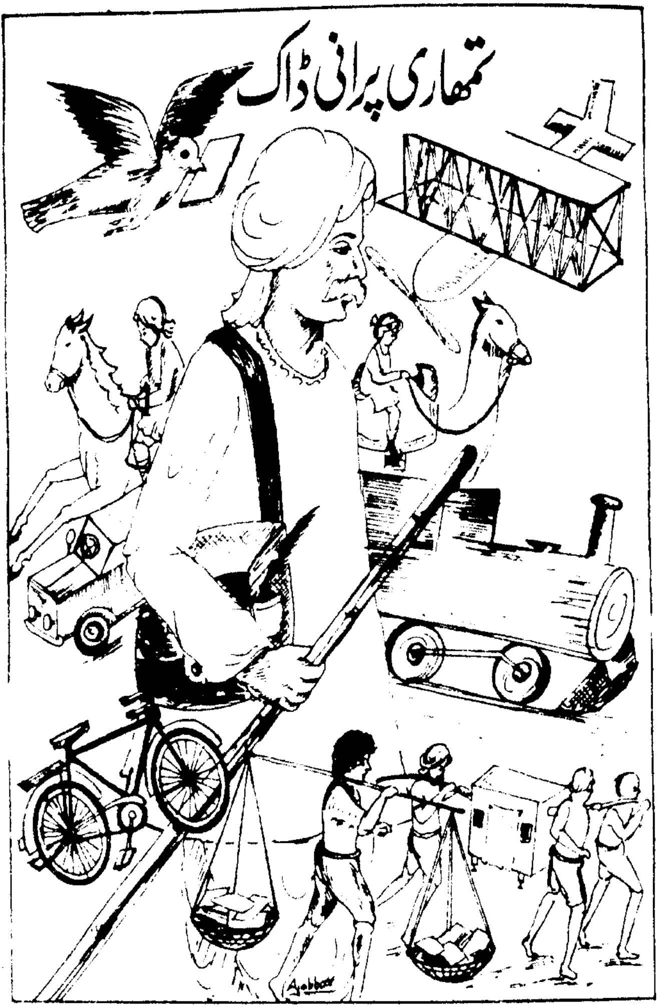
اچھا، ابھی تک تم نے میرے سفر میں کون کون سی سواریاں دیکھی ہیں ؟
آدمی ۔! ہاں، تم جانتے ہی ہو کہ آدمی بہت دِن تک میری سواری رہے پھر آدمیوں کے ساتھ گھوڑے آئے، میں نے سینکڑوں سال تک گھوڑا گاڑیوں اور رتھوں پر بھی سفر کیا۔ دریاؤں میں کشتیاں کام میں آئیں اور سمندر میں جہاز جہاں ضرورت ہوتی وہاں اونٹ، خچر اور دوسرے جانوروں سے بھی کام لیا جاتا۔
لیکن بھائی پچھلے ڈیڑھ سو سال میں تو انسان نے سواریوں میں ترقی کی کہ اگر آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے کا کوئی آدمی سُن لے کہ تم دلّی سے کلکتے یا بمبئی صرف دو گھنٹے میں پہنچ جاتے ہو تو وہ کسی طرح بھی یقین نہیں کرے گا۔ سواریاں تیز چلیں تو میرا چکر بھی پھیلا۔ اِس میں ایک بات بہت اچھی رہی۔ وہ یہ کہ جیسے ہی کوئی نئی سواری چلنی شروع ہوئی، جتنے جلدی بھی ہو سکا اُسے میرے لیے بھی استعمال کیا جانے لگا۔ جہازوں میں بھاپ کا انجن ۱۸۱۸ء میں لگنا شروع ہوا تو سمندر میں میں اور تیز تیرنے لگا۔ ۱۸۴۲ء تک یوروپ کے لگ بھگ سارے ملکوں میں میں ریل میں سفر کر رہا تھا۔ سچ پوچھو تو ریل ہی ایسی سواری ہے جس نے مجھے سب سے زیادہ تیز چلایا۔ اب چھوٹی چھوٹی جگہوں پر اور قریب قریب کے شہروں میں عام طور پر میں ریل پر ہی سفر کرتا ہوں۔ کچھ دِن بعد موٹریں آئیں تو وہ بھی میرے کام آنے لگیں۔ اور اِس کے بعد ہوائی جہاز آئے۔ ہوائی جہاز کے ذریعے میری سب سے پہلی ہوائی سیر ۱۹۱۹ء میں لندن اور پیرس کے بیچ ہوئی۔ اور آج دنیا کے ہر بڑے شہر میں اور ایک ملک سے دوسرے ملک کے سفر میں عام طور پر ہوا کی سواری ہی مجھے دی جاتی ہے۔ اب دیکھوں کہ تم مجھے اور کون سی تیز سواری دیتے ہو۔!

اچھا بھائی، اب تم سمجھ تو گئے ہو گے کہ میں اب تمہارے اپنے زمانے سے بہت قریب آگیا ہوں اور میرا سفر اب ختم ہونے والا ہے، مگر میں کہوں گا کہ میرا سفر ختم ہونے والا نہیں ہے۔ میں تو دنیا کے ساتھ ساتھ چل رہا ہوں۔ جیسے جیسے تم ترقی کرتے جا رہے ہو میں بھی آگے بڑھتا جا رہا ہوں۔ مگر ہاں ابھی تمھیں دو باتیں بتانی رہ گئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ میں تمہارے ملک میں تمہارے اپنے ہاتھوں میں کیسے پہنچا۔ اور دوسری یہ بات کہ آج کل میرے سفر میں کیا کیا خاص باتیں ہیں۔



ڈاک سے پہلے کا ایک چھوٹا سا لفافہ اور خط کا کچھ حصہ۔ (بشکریہ مولوی سید محمد عبادت صاحب ۔ا ۔د ۔)

تصویر نمبر ۵


تمھاری پرانی ڈاک

پردادا کا خط

اگر یاد کرو تو میں نے تمھیں بتلایا تھا کہ خود تمھارے ملک کے بادشاہ بھی اپنے لیے ڈاک لانے لے جانے کا بڑا اچھا طریقہ شروع کر چکے تھے۔ مگر یہ ڈاک عام آدمی کے لیے نہیں تھی۔ تم نے اپنی تاریخ کی کتابوں میں پڑھا ہوگا کہ انگریزوں نے ہندستان میں آنا شروع کیا، اور کچھ دن بعد انھوں نے ایک کمپنی کھولی جس کا نام تھا، ایسٹ انڈیا کمپنی، یہ کمپنی پہلے تو ہندستان اور برطانیہ کے بیچ تجارت ہی کرتی تھی، مگر بعد میں اس نے ہندستان پر حکومت بھی کرنی شروع کر دی۔ اب ہوا یہ کہ انھیں اپنے کاموں میں ڈاک کی بہت سخت ضرورت پیش آتی تھی۔ بس ہماری آج کی ڈاک ایک طرح سے اِن ہی کی دین ہے۔

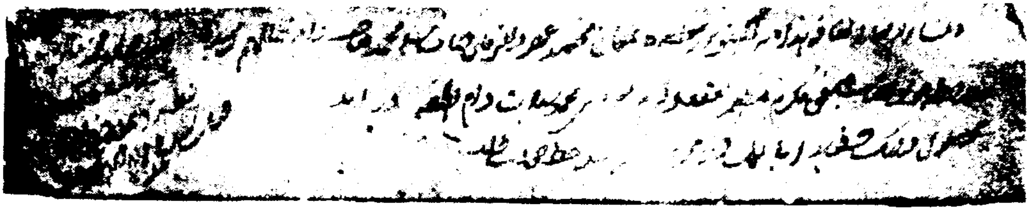
'ایسٹ انڈیا کمپنی' کے ایک بہت بڑے افسر تھے لارڈ کلائیو' جو بنگال کے گورنر بھی تھے۔ انھوں نے ڈاک کا انتظام ۱۷۶۶ء میں پھر باقاعدہ شروع کرنے کی کوشش کی۔ تم نے اپنی تاریخ کی کتابوں میں پڑھا ہوگا کہ اُس وقت مغل بادشاہ بہت کمزور ہو گئے تھے۔ اب جب بادشاہ ہی کمزور ہوں تو اُن کی ڈاک کا حال بھی ویسا ہی ہوگا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی، کی ڈاک میں بھی شروع میں عام آدمی اپنے خط نہیں بھیج سکتے تھے۔ لیکن آٹھ دس سال بعد ہی اِس میں سرکاری خطوں کے علاوہ عام آدمیوں کے خطوں کو لے جانے کی بھی اجازت مل گئی۔ مگر اس کے ساتھ ایک پریشانی بھی تھی۔ وہ یہ کہ ڈاک صرف انہی حصّوں کے اندر سفر کرتی جو، ایسٹ انڈیا کمپنی کے پاس تھے۔ جیسے کلکتہ، بمبئی، مدراس وغیرہ۔ مگر یہ چکر آہستہ

آہستہ پھیلتا چلا گیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی، کی ڈاک کے علاوہ تمھارے یہاں کچھ اور طریقے بھی چل رہے تھے خط پہنچانے کے۔ انھی میں ایک سب سے زیادہ مشہور" مہاجن ڈاک" تھی مہاجنوں کا اصلی کام ہوتا ہے لوگوں کو سود پر روپیہ ادھار دینا، مقررہ زمانے میں سود اور اصل کا روپیہ وصول کرنا۔ اس کام کے لیے انہیں گاؤں گاؤں اور شہر شہر اپنے آدمی بھیجنے پڑتے تھے۔ بس تمھارے یہاں ان مہاجنوں نے بھی لگ بھگ ایسا ہی کام کیا جیسا ایک زمانے میں یورپ میں قصائی کیا کرتے تھے۔ ان مہاجنوں نے اپنے آدمیوں کے ذریعے اپنے کاغذوں کے ساتھ لوگوں کے خط بھی بھیجنے شروع کر دیے۔ اس طریقے کو "مہاجن ڈاک" کہا جانے لگا ۱۸۳۷ء میں" ایسٹ انڈیا کمپنی" نے ڈاک کے ایسے سارے کاروبار بند کر دیے اور اس طرح " مہاجن ڈاک" بھی بند ہو گئی۔

'ایسٹ انڈیا کمپنی، کی ڈاک میں بھی سارے اصول وہی تھے جو اس زمانے میں تم یورپ میں دیکھ چکے ہو۔ وہی بات کہ جتنی دور خط سفر کرے گا اتنی ہی زیادہ اُس کی قیمت بھی ہو گی۔ مثال کے طور پر اُس وقت جو خط سو میل سفر کر لیتا تھا اس کے لیے اُس وقت کے دو آنے کا ایک تانبے کا ٹوکن الگ کر لیا جاتا تھا۔ اب اگر وہ دو سو میل چلا تو دو ٹوکن، اور تین سو میل چلا تو تین ٹوکن جمع ہو گئے، اور آخر میں خط لینے والے سے ٹوکن گن کر پیسے لے لیے گئے۔

ویسے تو دو آنے تم آج کے پیسوں میں صرف بارہ پیسے ہی کہہ سکتے ہو۔ تم کہو گے کہ یہ تو کوئی بہت مہنگا خط نہیں ہوا! لیکن یہ بات بھی ذہن میں رکھنا کہ اُس وقت کے دو آنے اتنا بہت سا سامان خرید سکتے تھے جتنا اب شاید ایک روپیے میں بھی نہیں خریدا جا سکتا۔ بس یوں سمجھ لو کہ اس وقت دو آنے میں لگ بھگ چار پانچ سیر گیہوں خریدے جا سکتے تھے۔ اب کچھ کچھ تمھاری سمجھ میں آگیا ہو گا کہ سو میل دور خط بھیجنے میں کتنا پیسہ خرچ ہوتا ہو گا اور کتنے لوگ ایسے خط بھیج سکتے ہوں گے۔



تصویر نمبر ۶۔ آج کی ڈاک کے ایک بہت پُرانے لفافے کے دونوں رُخ۔ ڈاک کی مہر موجود ہے، مگر ٹکٹ ابھی شروع ہی نہیں ہوئے تھے۔



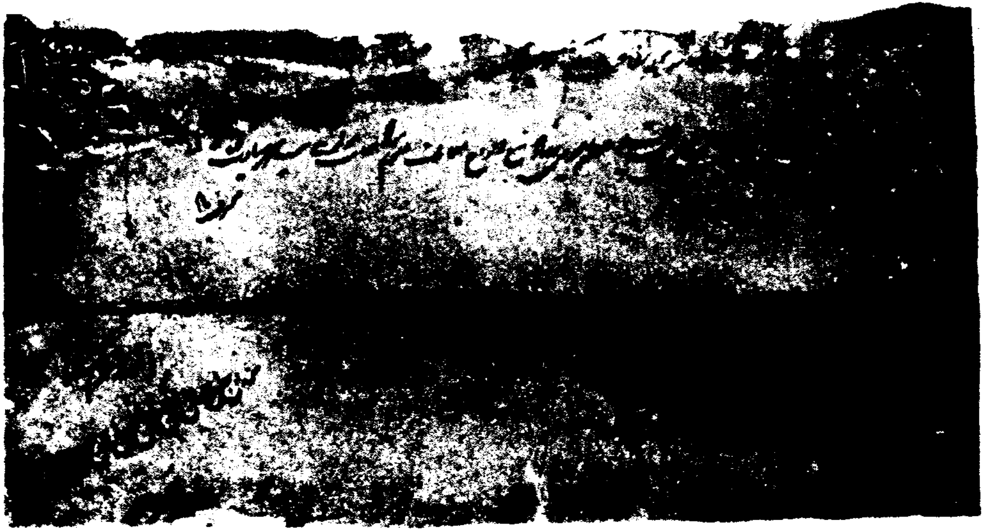
تصویر نمبر ۷

پتہ:۔ انشاءاللہ تعالیٰ لفافہ ہذا بہ لکھنؤ رسیدہ بمکان مجتہد عصر والزماں جناب سید محمد صاحب دام ظلہم رسیدہ بملاحظہ مولوی صاحب مشفق مکرم مظہر۔۔ وکرم مولوی محمد سیادت دام لطفہ، ورآید بحصول ڈاک لفافہ ہذا بالکل در امروہہ دادہ شد خط جواب طلب دوسری طرف:۔ راقم سید امام علی متوطن امروہہ مرقومہ یازدہم (۱۱) ماہ جمادی الاول ۱۲۶۳ ہجری ڈاک کی مہر بحصول ۲/ (دو آنے) وغیرہ....... مولوی محمد سیادت صاحب روانہ شدہ.... خط ہذا بملاحظہ مولانا جناب سید محمد دام فضلہ بگذرد۔ (بشکریہ مولوی سید محمد عبادت صاحب امروہہ)

چنانچہ اگر کسی نے اپنے کسی دوست کو کلکتے سے بمبئی ایک تولے یا ۔ اگرام کا خط بھیج دیا تو بمبئی والے صاحب کو اُس وقت کا ایک روپیہ دینا پڑ گیا۔ میں نے شروع میں تمھارے پردادا کا قصہ سنایا تھا بس یہ سمجھ لو کہ تمھارے پردادا یا اُن کے دادا کو، ایسٹ انڈیا کمپنی، کی ڈاک سے ہی خط ملتے تھے۔

بہنگی ڈاک

اس وقت تمھارے یہاں کی ڈاک میں جو سواریاں میرے لیے کام میں لائی جاتی تھیں وہ تقریباً سب وہی تھیں جو تم پہلے بھی سُن چکے ہو۔ آدمی، گھوڑا، تانگہ، کشتی وغیرہ ۔ مگر ایک دلچسپ چیز ہندستان میں ڈاک لے جانے میں کام آتی تھی۔ تم نے گاؤں، بلکہ شہروں میں بھی کبھی کسی ایسے سبزی بیچنے والے کو دیکھا ہے جو گھر گھر جا کر سبزی بیچتا ہے ؟ اس کے کندھے پر ایک چیز ہوتی ہے جسے تم چاہو تو بہت بڑی 'ترازو' کہہ سکتے ہو۔ اِس بڑی سی ترازو کا نام ہے " بہنگی "، تو بھائی اِس زمانے میں ہندستان میں میں بہنگی میں بھی سفر کیا کرتا تھا۔ اور بھاری خط یا خاص طور پر جب کچھ سامان کہیں ڈاک سے بھیجنا ہوتا تو اِسی" بہنگی ڈاک " کے ذریعے بھیجا جاتا۔ یہ " بہنگی ڈاک " چونکہ عام طور پر صرف سامان بھیجنے میں کام آتی تھی اِس لیے آج جسے تم 'پارسل' کہتے ہو اُسے اُس زمانے میں " بہنگی ڈاک " ہی کہا جاتا تھا۔ اِس کے علاوہ ڈاک کے ذریعے ہی لوگ بھی ایک سے دوسری جگہ سفر کرتے ۔ جو لوگ گھوڑوں یا گھوڑا گاڑیوں پر نہ جانا چاہتے تو وہ پالکی پر سفر کرتے ۔ پالکی وہ خود لاتے اور ڈاک چوکیوں سے انھیں کہار دیے جاتے ۔ اب سمجھ لو کہ ایک آدمی کیا جاتا تھا، اُس کے ساتھ اچھا خاصا جلوس چلتا تھا ۔ آٹھ کہار، باری باری پالکی اٹھانے کے لیے، دو مشعلچی راستہ دیکھنے اور رات کے وقت مشعلیں جلانے کے لیے، اور دو کہار اُس کا سامان بہنگی پر لیے چلتے ۔ ایک دن میں صرف دس میل سفر کیا جاتا اور رات کو کسی سرائے میں رُکنا پڑتا۔



تصویر نمبر ۸

آج کی ڈاک سے پہلے کا ایک لفافہ۔ لفافے کو کھول دیا گیا ہے۔ پتے کے علاوہ خط کا محصول، بھیجنے کی تاریخ اور خوش نویسی کی مشق کے طور پر بھی کچھ لکھا گیا ہے۔ اس لفافے میں بھیجا گیا ایک خوبصورت خط اگلی تصویر میں دیا گیا ہے۔

(بشکریہ مولوی سید محمد عبادت صاحب۔ امروہہ)



ایک بہت پرانا خوبصورت خط۔ (بشکریہ مولوی سید محمد عبادت صاحب۔ امروہہ)

تصویر نمبر ۹

بہت اچھی سڑکیں بھی نہیں تھیں اور ہرکاروں کو دن دن بھر پیدل چلنا پڑتا تھا۔ اِن کا کام ہی تھا گاؤں گاؤں، شہر شہر گھومتے رہنا۔ دھوپ میں بارش میں، آندھی میں، جنگلوں بیابانوں میں۔ اگر تم اُس وقت کے ہرکاروں کا حال سنو تو دنگ رہ جاؤ۔ کیا تم سوچ سکتے ہو کہ اِس غریب کو تیس سیر وزن اٹھا کر ایک گھنٹے میں ساڑھے تین میل چلنا ہوتا تھا۔! میں تو بھائی اِن کی ہمتوں پر شاباش کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔

بعض بعض جنگلوں سے جب یہ ہرکارے گذرتے تو اِن کے ساتھ دو آدمی ڈھول پیٹنے کے لیے کیے جاتے تھے تاکہ جنگلی جانور اس کی آواز سُن کر بھاگ جائیں اور کبھی کبھی تو اِن ساتھ دو شکاری یا تیر چلانے والے بھی کر دیے جاتے۔ ایسی بھی کہانیاں سُننے میں آئیں کہ اُس وقت کے ہرکاروں کو جنگلی جانوروں نے کھالیا۔ لیکن ڈاک پھر بھی چلتی رہی۔

نئی ڈاک

پہلی اکتوبر ۱۸۵۴ء کو ایک طرح سے ہندستان میں ڈاک کو ہر امیر غریب کے لیے آسان کر دیا گیا۔ آج ایک غریب آدمی بھی ہندستان کے ہر کونے سے جہاں چاہے خط بھیج سکتا تھا۔ دو پیسوں یعنی آج کے تین پیسوں۔ میں لفافہ یا بند خط بھیجا جاسکتا تھا۔ شاید تم سوچ رہے ہوگے کہ یہ خط آج کے خط سے بہت سستا تھا، مگر ایسی بات نہیں ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ اگر تم آج کسی سے تین پیسے کے بھُنے چنے مانگو تو وہ تمھیں منع کر دے گا، اور اُس وقت کے دو پیسوں میں تمھیں اتنے چنے مل جاتے کہ تم تین وقت پیٹ بھر کر کھاتے اور شاید بچ رہتے۔ لیکن پھر بھی اُس وقت کے دو آنے کے مقابلے میں تو دو پیسے بہت کم تھے۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ جہاں سے چاہو خط بھیجو، جہاں تک چاہو بھیجو، وہی

دو پیسے ہیں۔ سچ، تمھارے پر دادا یا اُن کے والد کو کتنی خوشی ہوئی ہوگی ــ کچھ سال بعد تو اور بھی آسانی ہوئی ۱۸۷۹ء میں پوسٹ کارڈ بھی چلنے لگے ـ پوسٹ کارڈ کی قیمت پُرانا ایک پیسہ ہوتی تھی ـ

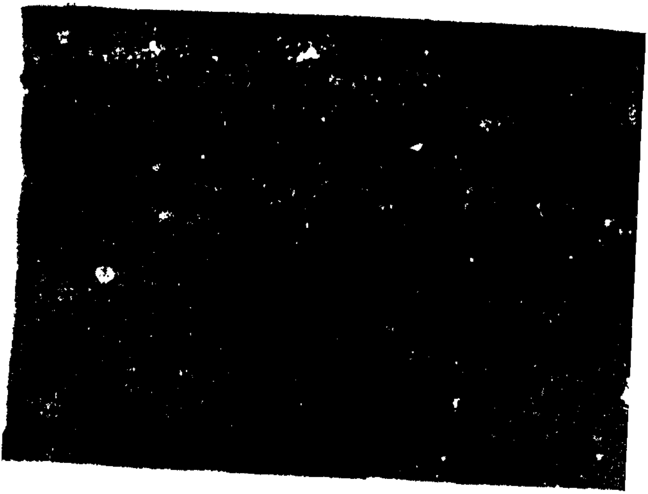
بڑے بڑے شہروں میں ..، ڈاک خانے کھلے اور تقریباً پچیس لاکھ خط سال بھر میں اِدھر اُدھر گھومے ـ بڑے بڑے قصبوں میں اسکولوں کے ہیڈ ماسٹروں یا کسی دوسرے پڑھے لکھے آدمی کے سپرد ڈاک خانے کے کام کیے گئے ہندستان میں ریل ۱۸۵۳ء میں آ ہی چکی تھی ـ لیکن ابھی بہت زیادہ پھیلی نہ تھی ـ لیکن جہاں جہاں تھی وہاں میرا سفر بھی تیز ہوگیا تھا، مگر یہ یاد رکھنا کہ ریل چاہے کتنی بھی پھیل گئی ہو، گھوڑوں اور آدمیوں کی سواری مجھ سے نہیں چھوٹی تھی ـ ریل تو مجھے صرف اسٹیشن تک ہی پہنچاتی تھی، وہ بھی کہیں کہیں ـ باقی سفر تو انھی دونوں کی مدد سے پورا ہوتا ـ گھوڑوں کی جگہ تو بہت سال بعد موٹروں نے لے لی مگر آدمی کی جگہ شاید کوئی کبھی نہ لے سکے گا ـ

ایک بات اور بھی نئی ہوئی اور وہ تھی ڈاک کے ٹکٹوں کا شروع ہونا ویسے ڈاک کے ٹکٹ دو سال پہلے سندھ کے کچھ ضلعوں میں چلے بھی تھے مگر یہ صرف ضلعے کے اندر ہی اندر چلتے تھے ـ سارے ہندستان کے لیے یہ بھی ۱۸۵۴ء ہی میں جاری کیے گئے ـ سب سے پہلے ٹکٹ پر انگلستان کی ملکہ وکٹوریہ کا چہرہ تھا ــ ظاہر ہے تمھیں آج کے خوبصورت ٹکٹوں کے مقابلے میں تو یہ کیا پسند آئیں گے مگر اُس وقت تو اِن کی اتنی قدر تھی کہ ہر شخص خوش نظر آتا تھا ـ ہاں ایک بات اور اُس وقت اِس کا نام "ٹکٹ" نہیں تھا ـ لوگ اِسے "ڈاک لیبل" کہتے تھے، اور شروع میں انھیں تمھارے ملک میں ہی چھاپا جاتا تھا ـ بعد میں اِن کی چھپائی لندن میں ہونے لگی، اور بہت خوبصورت ٹکٹ چھپے ـ

ٹکٹوں کی کہانی خود الگ ایک بہت دل چسپ کہانی ہے ـ یہ پوری کہانی تو اِس وقت نہیں سُنائی جاسکتی مگر اس کے متعلق کچھ عجیب عجیب اور دلچسپ باتیں تمھیں

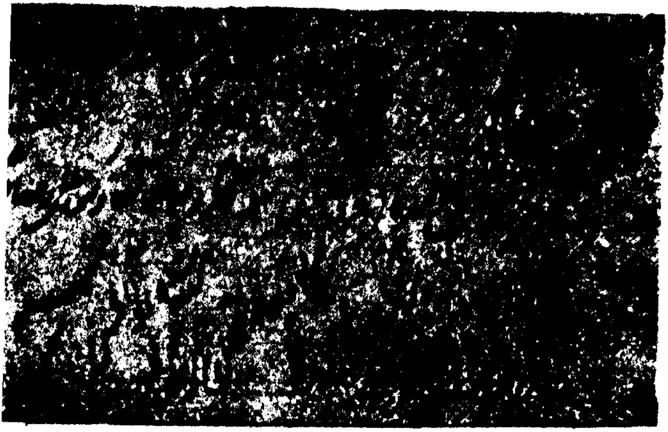
ضرور بتلاؤں گا۔ اِس وقت تو یہ دیکھیں کہ اِس نئی ڈاک کے شروع ہونے کے بعد کیا کیا کچھ ہوا۔

ہندستان میں میرے اتنا پھیل جانے کے بعد بھی بہت سی جگہیں ایسی تھیں جہاں اب بھی یہ ساری آسانیاں نہیں مل سکی تھیں۔ تمھیں پتہ ہے کہ ہندستان میں چھوٹی چھوٹی اور بڑی بڑی بہت سی ریاستیں تھیں۔ جو ابھی بیس پچیس سال پہلے تک موجود تھیں۔ اِن میں الگ الگ راجاؤں، مہاراجاؤں اور نوابوں کا راج تھا، اور اِن پر انگریزوں کی حکومت نہیں تھی، ہاں انگریز اِن پر تھوڑا بہت اثر ضرور رکھتے تھے۔ لیکن ڈاک کے سلسلے میں یہ ریاستیں بہت دن بعد تک آزاد رہیں اور انھوں نے اپنی حدوں میں خود اپنی ڈاک کا ایک الگ نظام رکھنا



تصویر نمبر ۱۸

نئی ڈاک کا ایک چھوٹا پوسٹ کارڈ۔ (بشکریہ جناب مولوی سید محمد عبادت صاحب، امروہہ)



تصویر نمبر۲

نئی ڈاک کا ایک چھوٹا لفافہ۔

پتہ :۔ بفضلہ تعالیٰ بمقام قصبہ پنڈراول ضلع بلند شہر تحصیل خورجہ۔ بخدمت کنور صاحب مشفق مہربان دوستان کنور محمد رضا خاں صاحب و کنور علی رضا صاحب۔

راقم سید شاہ ابوالحسن از اسمعیل پور ضلع انبالہ تحصیل نرائن گڑھ پرگنہ ساڈھورہ مورخہ ۲۵ر جنوری ۱۸۶۸ء بصیغہ پیڈ۔ جواب عریضہ مرحمت ہو۔

(بہ شکریہ رضا لائبریری و کاظم علی خاں صاحب مرحوم۔امروہہ)

پسند کیا۔ کہیں ۱۸۶۶ء میں جا کر سب سے پہلے پٹیالہ کے راجا نے اس نئی ڈاک کے طریقے کو اپنایا اور پھر کچھ دن بعد آہستہ آہستہ بہت سی ریاستیں اِسے اپنا تی گئیں۔

اِس نئی ڈاک کا چکر آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا کہ اِس بیچ میں خود تمھارے ملک میں ایک بہت بڑا واقعہ ہوا۔ یہ تھی ۱۸۵۷ء کی تمھاری پہلی آزادی کی کوشش۔ حالانکہ اس واقعے سے میرا کوئی سیدھا تعلق نہیں ہے لیکن چونکہ اس کا اثر خود تمھارے بزرگوں پر بہت پڑا اس لیے مجھ پر بھی بہت پڑا۔ اصل میں ہوا یہ کہ اچھے لوگ تو خیر ملک کو آزادی دلانے کے لیے لڑے لیکن کچھ خراب لوگوں نے اِس وقت خراب کام بھی کیے۔ لوٹ مار مچائی، اور سب سے بُری بات یہ کہ بعض جگہوں پر میرے گھروں یعنی ڈاکخانوں اور ڈاک کو بھی لوٹ لیا۔ تمھارے ملک میں میری صحیح زندگی بس شروع ہی ہوئی تھی، میری جڑیں بھی ابھی پوری طرح نہیں جم سکی تھیں کہ یہ آفت آئی۔ مگر خیر میں نے جھیل لی، اور تھوڑے بہت پریشانی کا وقت گزار کر میں پھر ترقی کرنے لگا۔

خط کا ایک اور گُن

اچھا ہے یہاں میں تمھیں اپنا ایک اور گُن بھی بتاتا چلوں۔ اب تک تو تم یہی سمجھتے ہو کہ میرا یعنی خط کا صرف ایک کام ہے۔ ایک آدمی کا حال دوسرے کو جاکر بتلا دینا۔ ٹھیک ہے! میرا اصلی مقصد تو یہی ہے۔ مگر کچھ لوگ اپنے ہی حال کو کچھ ایسے ڈھنگ سے لکھتے ہیں کہ وہ صرف اُن کا حال نہیں رہتا بلکہ اُن کے چاروں طرف جو حال ہے یا جو خاص خاص خبریں ہیں، اُن کا پتہ بھی پڑھنے والے کو ہو جاتا ہے۔

تمھارے ملک میں ایک بہت بڑے شاعر تھے۔ مرزا غالب انھوں نے اپنے دوستوں کو بڑے اچھے اچھے خط لکھے۔ اِن کے کچھ خطوں سے ۱۸۵۷ء کی اس گڑبڑ کے حالات جتنی اچھی طرح معلوم ہو جاتے ہیں کسی اور طریقے سے معلوم نہیں ہو سکتے۔ مثال کے طور پر تم اپنی تاریخ کی کتابوں میں یہ تو پڑھ لوگے کہ کون سی فوج کہاں لڑی، کس کی ہار ہوئی، کون جیتا وغیرہ وغیرہ۔ مگر تم یہ نہیں جان سکتے کہ اُس وقت

عام آدمی پر کیا گذری، کیا کیا مصیبتیں نازل ہوئیں۔ اگر غالب کے خط نہ ہوتے تو شاید کوئی بھی یہ بات نہ جانتا کہ دلّی کے کون کون سے بڑے لوگ مارے گئے، کون کون سے محلے تباہ ہوئے۔ پھر کس کو معلوم ہوتا کہ اُس سال بارش بھی نہیں ہوئی تھی، دلّی کے کنویں تک سوکھ گئے تھے، ہیضے کی وبا بھی پھیلی تھی، اور معلوم کیا کیا آفتیں لوگوں پر آئی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ اچھے ادیبوں شاعروں اور لکھنے پڑھنے والوں کے خطوں کی قدر کرتے ہیں اور بعض بعض لوگوں کے خطوں کو بڑے بڑے میوزیموں میں بھی احتیاط سے رکھ لیا جاتا ہے۔ تم بھی ایسا کرو کہ اپنے دادا یا کسی ایسے ہی بزرگ کے پاس جاؤ اور اگر اُن کے پاس کچھ پرانے خط رکھے ہوں تو انھیں پڑھو۔ دیکھو اس میں تمھیں کتنا مزہ آتا ہے۔

آزادی سے پہلے

اچھا بھائی آؤ، اب تھوڑا سا سفر اور رہ گیا ہے۔ اُسے بھی پورا کریں۔ ہم اپنے باقی سفر کے دو حصّے کرلیں تو بہت آسانی ہوگی۔ پہلا حصّہ اس وقت سے شروع ہوکر جب کا میں ذکر کر رہا ہوں، تمھارے ملک کی آزادی تک ہوگا اور دوسرا تمھاری آزادی کے پچیس سال بعد، یعنی بالکل تمھارے وقت تک ہوگا۔

پہلی بات تو میں تمھیں یہ بتلادوں کہ ۱۸۵۴ء میں جو اصول ڈاک کے لیے اپنائے گئے تھے۔ اُن میں اِس کے بعد سے آج تک کوئی فرق نہیں آیا۔ صرف وقت کے ساتھ ساتھ ترقی ہوتی گئی۔ ڈاکخانوں کے سپرد نئے نئے کام کیے گئے اور جتنا بھی ممکن ہوسکا لوگوں کو آسانیاں دی گئیں۔ مگر چونکہ تمھارے ملک میں خود تمھارا راج نہیں تھا، اِس لیے میری ترقی بھی اتنی تیز نہیں ہوئی جتنی آزادی کے بعد ہوئی۔

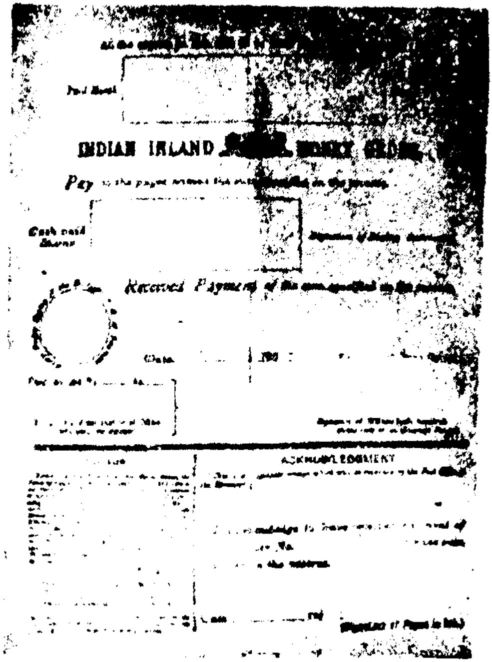
تم نے پہلے سنا تھا کہ ایک زمانے میں یوروپ کے ملکوں میں سرکاری خط مفت جاتے تھے۔ ہندستان میں بھی شروع میں حکومت کے خط مفت لے جانے

کا دستور تھا، لیکن ڈاک کے عام ہونے کے کوئی بیس سال بعد ہی اِس لعنت کو ختم کر دیا گیا، اور کچھ ایسے ٹکٹ چلائے گئے جنھیں صرف سرکاری خطوں پر ہی لگایا جا سکتا تھا۔ ان کو "سروس ٹکٹ" یا "سرکاری ٹکٹ" کہتے ہیں۔ یہ ٹکٹ آج بھی موجود ہیں۔ تم اپنے ابا جان یا کسی اور بزرگ کے پاس آیا ہوا کوئی سرکاری خط دیکھ لو، تمھیں اس پر یہی ٹکٹ نظر آئے گا

۱۸۸۰ء میں میرے گھر کے ذریعے ایک اور بڑا کام بھی شروع کیا گیا۔ یہ تھا منی آرڈر پہنچانے کا کام۔ منی آرڈر تو اِس سے پہلے بھی آتے جاتے تھے، مگر اُس کا ایک بالکل الگ طریقہ تھا۔ جس وقت اِس کام کو میرے گھر والوں کے سپرد کیا گیا۔ اُس وقت منی آرڈر لینے کا طریقہ کچھ اِس طرح تھا کہ جس کے نام منی آرڈر آئے، اُسے صرف کوپن بھیج دی جاتی تھی، وہ شہر کے ڈاکخانے جا کر روپیہ وصول کرلاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ڈاکخانے کے چکر لگانے میں لوگوں کو بڑی دقت ہوتی ہوگی، اِس لیے پانچ چھ سال بعد ہی یہ بھی گھر پر پہنچایا جانے لگا۔ یہ طریقہ جرمنی اور یورپ کے کچھ ملکوں میں پہلے سے ہی چل رہا تھا۔ اور آج منی آرڈر کی جو فیس تم ڈاکخانے میں نقد دیتے ہو اس وقت اتنے ہی پیسوں کے ٹکٹ منی آرڈر کرنے والے کو منی آرڈر فارم پر چپکانے پڑتے تھے۔

۱۸۹۳ء میں میرے گھر کا نام بھی بدلا۔ چونکہ میرے گھر والوں کو ایک اور بڑا کام سونپا گیا تھا۔ یہ تھا تار لینے اور پہنچانے کا کام۔ اُس وقت سے اب تک میرے گھر کا نام "ڈاک تار گھر" ہے۔ ظاہر ہے کہ اِس سے لوگوں کو بڑی آسانی ہوئی ہوگی، اور آج تو لگ بھگ پانچ کروڑ تار ہر سال ملک میں گھومتے ہیں۔ کچھ دن بعد ہی ڈاکخانے والوں نے "تار منی آرڈر" کا کام بھی شروع کر دیا، اب روپیہ بھی بہت جلدی لوگوں تک پہنچ سکتا تھا۔

اسی زمانے میں صرف خطوں کے بھیجنے میں بھی کچھ نئی باتیں شروع کی گئیں۔ جیسے تم اگر چاہو تو کچھ زیادہ پیسے دے کر رجسٹرڈ خط بھی بھیج سکتے ہو۔ مگر رجسٹرڈ


INDIAN INLAND [illegible] MONEY ORDER

Pay [illegible]

Cash paid

Received Payment [illegible]

Date

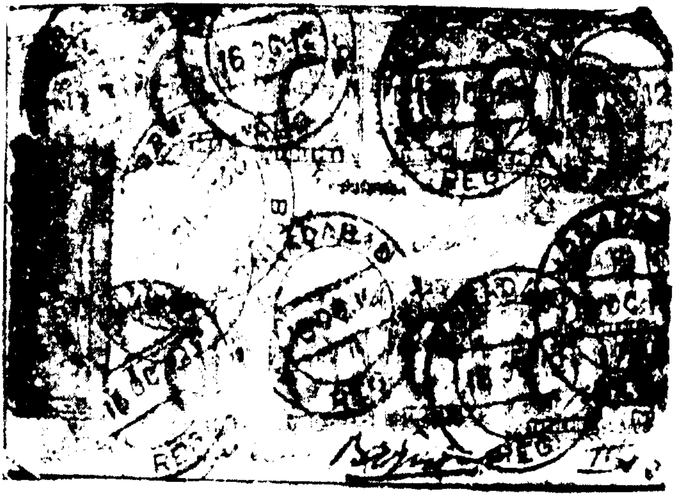
ACKNOWLEDGMENT

تصویر نمبر ۱۲

پرانا منی آرڈر فارم ۔ اوپر سے دوسرے خانے میں منی آرڈر کی فیس کی جگہ ٹکٹ چپکانے جاتے

(بشکریہ مولوی سید محمد عبادت صاحب ۔ الہ آباد)

خط عام لیٹر بکسوں میں نہیں ڈالے جاتے۔ اِس خط کو ڈاکخانے میں تولا جاتا ہے، اور اُس کے وزن کے اعتبار سے اُس پر ٹکٹ لگائے جاتے ہیں۔ پھر اسے رجسٹر پر چڑھا کر احتیاط سے بھیجا جاتا ہے۔ اُس کی رسید بھی تمھیں دی جاتی ہے، اور اگر تھوڑے پیسے اور خرچ کیے جائیں تو خط وصول کرنے والے کی طرف سے بھی رسید تمھارے پاس آ سکتی ہے۔ رجسٹرڈ خط اور عام خط میں فرق یہ ہے کہ ڈاکخانہ اس بات کی ذمے داری لیتا ہے کہ یہ خط ضرور پہنچ جائے گا۔ چونکہ یہ ہر جگہ رجسٹروں پر چڑھایا جاتا ہے۔ اس لیے اِس کی تلاش بھی آسان ہوتی ہے۔ معمولی خط جنھیں تم روزانہ اِدھر اُدھر بھیجتے ہو پہنچتے وہ بھی ضرور ہیں۔ مگر لاکھوں کروڑوں خطوں کی بھاگ دوڑ میں



تصویر نمبر ب

نئی ڈاک کا ایک رجسٹرڈ خط۔

پوسٹ کارڈ پر چھپے ہوئے ٹکٹ کے علاوہ ۱۲ ٹکٹ اور ایک رجسٹرڈ کی چیپی الگ چپکائی گئی ہے۔

(بشکریہ سید ظہیر الحسن صاحب۔ امروہہ)

اگر کوئی خط کہیں کھو جائے تو اس کا ڈھونڈنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ رجسٹرڈ خط کے ساتھ ہی ایک خط اور بھی ہوتا ہے۔ اسے "انشورڈ" خط کہتے ہیں۔ اس میں اور زیادہ پیسے لگتے ہیں۔ اس میں تم لاکھ گرم کرکے لفافے پر اپنے نام کی مہر لگاتے ہو اور ڈاکخانے جاکر بتلاتے ہو کہ تم سَو یا دو سَو روپیے کے لیے اس خط کا بیمہ کرانا چاہتے ہو۔ ڈاکخانے والوں کی ذمہ داری یہ ہے کہ جس کو یہ خط بھیجا گیا ہے، اس کے پاس یہ اس طرح پہنچے کہ اُس پر تمھارے نام کی لاکھ کی مہر نہ ٹوٹے۔

اگر تم کوئی چیز چھپی ہوئی بھیجنا چاہو۔ جیسے اخبار، رسالے، شادی کے دعوت نامے وغیرہ تو انھیں تم "بک پوسٹ" سے بھیج سکتے ہو۔ مگر ان میں تم اپنے ہاتھ کا لکھا پرچہ نہیں رکھ سکتے۔ اگر کوئی یہ چاہے کہ اپنے بھیجے ہوئے خط کی رسید بھی اپنے پاس رکھے تو وہ تھوڑے سے پیسے دے کر اپنے خط کو "انڈر پوسٹل سرٹیفکیٹ" بھیج سکتا ہے۔

اس کے علاوہ کچھ پیسوں کے زیادہ ٹکٹ لگا کر تم "ایکسپریس" یعنی جلدی چلنے والا خط بھی بھیج سکتے ہو۔ پھر ڈاک کے ذریعے تم تھوڑا بہت سامان بھی بھیج سکتے ہو جسے پارسل کہتے ہیں۔ پارسل پر تمھیں اس کے وزن کے اعتبار سے ٹکٹ لگانے ہوتے ہیں اور ایسا پارسل بھی تم گھر بیٹھے منگوا سکتے ہو جس کے پیسے تم اُس وقت ادا کرو جب تمھیں وہ پارسل مل جائے۔ ایسے پارسل کو انگریزی میں چھوٹا کرکے وی۔ پی۔ پی (V.P.P.) کہتے ہیں۔ لوگ عام طور پر اس کے ذریعے کتابیں یا دوائیں وغیرہ دوسری جگہوں سے منگوالتے ہیں۔

ہاں، ایک اور بات یاد آئی۔ تم ایسا خط بھی بھیج سکتے ہو جس کے جواب کے پیسے بھی تم خود ہی ادا کرو۔ اس کی سب سے آسان مثال تو جوابی پوسٹ کارڈ ہی ہے لیکن ایک اور طریقہ بھی ہے جس کو بڑی بڑی کمپنیاں اور بیوپاری استعمال کرتے ہیں۔ وہ اپنے ناموں کو ڈاکخانے میں لکھوالیتے ہیں اور اپنے پتے کے لفافے یا خط چھپوالیتے ہیں۔ اب اگر انھیں کسی کو ایسا خط بھیجنا ہو تو وہ اپنے خط کے ساتھ

وہ چھپا ہوا لفافہ یا خط بھیج دیتے ہیں۔ جواب لکھنے والے کو اِس خط پر ٹکٹ چپکانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب وہ جوابی خط آئے گا تو وہ ڈاکخانے میں لکھ لیا جائے گا اور بعد میں اُس کمپنی سے پورا حساب ہو جائے گا۔ اِس کی ایک ایسی مشین بھی ایجاد کر لی گئی ہے جو ایسی مہر لگاتی ہے جس پر بھیجنے والے کا نام اور پتہ ہوتا ہے اور اِس میں ایک میٹر لگا ہوتا ہے جو اِن مہروں کو گنتا رہتا ہے۔ بعد میں اِن تمام مہروں کا حساب کر کے ڈاکخانے کو پیسے ادا کر دیے جاتے ہیں۔ اب تو ایسا تار بھی بھیجا جا سکتا ہے جس کے جواب کے پیسے بھی بھیجنے والا ہی ادا کر دے۔

اچھا! کیا تمھیں پتہ ہے کہ اگر تم اپنے لفافے یا کسی خط پر ٹکٹ چپکانا بھول جاؤ یا کوئی شخص جان بوجھ کر ٹکٹ نہ لگائے تو اُس کا کیا ہوتا ہے؟ تم کہو گے کہ ڈاکخانے والے اُسے پھاڑ کر پھینک دیتے ہوں گے! بات یہ ہے کہ ڈاکخانے کا پہلا اصول یہی ہے کہ جس طرح بھی ہو عام آدمی کی خدمت کی جائے۔ اس لیے وہ اِس خط کو پھاڑتے نہیں، بلکہ جسے وہ بھیجا گیا ہے اُس کے پاس لے جاتے ہیں اور اُس سے ٹکٹوں کی قیمت سے دُگنے پیسے لے کر خط اُسے دے دیتے ہیں۔ اِس طرح خط بھی پہنچ جاتا ہے اور ٹکٹ نہ لگانے کی سزا بھی تھوڑی بہت بھگتنی پڑ جاتی ہے۔ ایسے خط کو "بیرنگ" خط کہتے ہیں۔ یہ شاید اُس زمانے کی بچی کھچی آخری نشانی آج تک چلی آ رہی ہے جب میری قیمت خط پانے والا ادا کیا کرتا تھا۔

ہاں، تو میں تمھیں یہ بتا رہا تھا کہ یہ ساری آسانیاں تمھیں اُسی زمانے میں ملنی شروع ہو گئی تھیں جس کا میں نے پہلے ذکر کیا، یعنی ۱۸۵۴ء سے ۱۹۴۷ء تک کے زمانے میں۔

ممکن ہے تمھیں یہ نہ معلوم ہو کہ میں تمھارے فوجی سپاہیوں کے پاس اِس نظام کے ذریعے نہیں پہنچتا جس کے ذریعے تمھارے ہاتھوں میں آتا ہوں۔

ویسے تو اِس نظام کے اصول بھی وہی ہیں جو تمھارے اپنے نظام کے ہیں مگر چونکہ سپاہیوں کے اصلی پتے عام آدمیوں کو معلوم نہیں ہوتے اِس لیے میرے پہنچانے کا کام بھی فوج ہی کے ایک حصّے کے سپرد ہے۔ خاص طور پر جب تمھارے جوان مورچوں پر لڑ رہے ہوں۔ آج ایک جگہ تو کل دوسری جگہ، نہ اُن کا کوئی گھر ہو نہ ٹھکانا۔ تو بتاؤ تمھارا غریب ڈاکیا انھیں کہاں کہاں ڈھونڈتا پھرے گا۔ بس اِسی لیے اِس نظام کو تمھارے نظام سے کچھ الگ کر دیا گیا ہے۔

اچھا بھائی یہ تو تھے وہ کام جو خطوں کے آنے جانے سے ہی تعلق رکھتے ہیں مگر میرے گھر والوں کے سپرد تو کچھ اور ایسے کام بھی کیے گئے ہیں جن کا ڈاک پہنچانے سے کوئی سیدھا تعلق نہیں ہے۔ مگر چونکہ ہر شہر اور ہر بڑے قصبے میں میرا گھر موجود تھا، اِس لیے بہت سے ایسے کام جن کا فائدہ عام جنتا کو پہنچتا تھا انھیں بھی ڈاکخانوں کو دے دیا گیا۔

پہلے، ہر شہر میں بینک بھی نہیں تھے۔ مگر ڈاکخانے ضرور تھے۔ اب اگر چوروں اور لٹیروں کے ڈر سے کوئی اپنے پیسے کہیں جمع کرانا چاہے تو وہ بھی اپنے قریب کے ڈاکخانے میں جمع کرا سکتا تھا۔ ڈاکخانے میں اپنے روپیے پیسے جمع کرانے کا رواج بہت عام ہوا۔ بات یہ تھی کہ ڈاکخانا لوگوں کی جتنی خدمت کرتا تھا اور اِن کی جتنی ضرورتیں پوری کرتا تھا اس کی وجہ سے لوگوں کو اس پر اعتبار بہت ہو گیا۔ آج بھی پورے ملک میں لگ بھگ دو کروڑ لوگوں نے اپنے روپیے جمع کرا رکھے ہیں۔ ڈاکخانوں کے پاس اِن کے تقریباً ۴۲ ارب ۴۴ کروڑ روپیے جمع ہیں۔

اب اگر تمھیں دو یا پانچ یا کچھ تھوڑے سے روپیے بھیجنے ہوں تو تم منی آرڈر کے علاوہ بھی ایک اور طریقے سے بھیج سکتے ہو۔ "پوسٹل آرڈر" کے ذریعے تم ڈاکخانے جاؤ، دو روپیے کا ایک خوبصورت سا "پوسٹل آرڈر" خریدو۔ اُس پر اس کا نام پتہ وغیرہ لکھو جسے تم روپیے بھیجنا چاہتے ہو اور اُس کے ساتھ لگی ہوئی رسید کو اپنے

پاس رکھ لو۔ پھر اُس پوسٹل آرڈر کو لفافے میں رکھ کر بھیج دو۔ لو، چلے گئے تمھارے روپیے۔

اور تمھارے گھر میں ریڈیو، ٹرانزسٹر یا ٹیلی ویژن ہے؟ اپنے ابّا سے پوچھو وہ تمھیں بتائیں گے کہ وہ ہر سال اِس کی فیس یا ٹیکس ڈاکخانے میں ہی جمع کراتے ہیں۔ آج کل پورے ملک میں کوئی پینسٹھ ہزار ٹیلی ویژن اور لگ بھگ تیرہ کروڑ ریڈیو لائسنسوں کی فیس ڈاکخانوں میں ہی جمع کرائی جاتی ہے۔ اِسی طرح جب تمھارے بزرگ روپیوں کا لین دین کرتے ہیں تو انھیں ایک رسید لکھنی پڑتی ہے جس پر تھوڑا سا حکومت کو بھی ٹیکس دینا پڑتا ہے۔ اب اِس چند پیسوں کا ٹیکس دینے کے لیے آدمی کہاں کہاں مارا مارا پھرے۔ بس آسان طریقہ یہ ہے کہ وہ ڈاکخانے جائے، ایک رسیدی ٹکٹ خریدے اور رسید پر چپکا دے۔

ہاں ایک دلچسپ بات اور یاد آئی۔ تمھارے ملک میں ایک زمانے میں ملیریا کی بیماری بہت پھیلی تھی، اور اِس سے لوگوں کو بڑی تکلیف ہوتی تھی پہلے اِس کی دوا صرف کونین ہوتی تھی۔ اب آج سے ستّر اسّی سال پہلے اتنے ڈاکٹر اور اتنے اسپتال تو تمھارے ملک میں تھے نہیں جتنے آج ہیں۔ اب یہ دوا کہاں سے پہنچی جائے؟ اس طرح کہ گاؤں گاؤں میں پہنچ جائے۔ ۱۹۰۲ء میں چھوٹے بڑے سب ملا کر دس ہزار ڈاکخانے موجود تھے۔ پھر ان کے ڈاکیے گاؤں گاؤں بھی جاتے تھے۔ بس حکومت کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ عام آدمی کے پاس ڈاکخانے کے ذریعے ہی پہنچا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ڈاکخانے والوں کے سپرد کونین بیچنے کا کام بھی کیا گیا۔

خود تمھارے بزرگوں نے بھی یہ خیال رکھا کہ ملک میں جیسے ہی کوئی نئی سواری چلنی شروع ہو اُسے فوراً ہی ڈاک کے پہنچانے میں استعمال کرنا شروع کر دیا جائے۔ ۱۹۱۱ء میں ہوائی جہاز اُڑنے شروع ہوئے اور بس اِس کے دس سال بعد ہی ہندستان اور برطانیہ کے درمیان ڈاک کا آنا جانا شروع ہو گیا۔ پھر چھ مہینے کے اندر ہی کراچی سے (جو اس وقت ہندستان کا ہی ایک شہر تھا) دلّی تک ہوائی ڈاک آنے جانے لگی۔


مشکلیں اور علاج
LETTER BOX
E. RAILWAY

سفر کی پریشانیاں

اب جب تم نے میرے متعلق اتنا کچھ جان لیا ہے تو میرے سفر کی ایک پریشانی بھی سُن لو جس سے میرے گھر والے ہمیشہ پریشان رہے ہیں، اور عجیب بات یہ ہے کہ جیسے جیسے وقت گذرتا جارہا ہے ویسے ویسے یہ پریشانی بھی بڑھ رہی ہے۔ اصل میں میری اِس پریشانی کا تعلق ہے میری تعداد سے ۔ یہ پریشانی ہے میری چھٹائی، کی جسے انگریزی میں (SORTING) کہتے ہیں۔ تم نے میرے شروع کے سفر میں دیکھا تھا کہ میری تعداد بہت کم تھی۔ اِس لیے اتنی پریشانی بھی نہ تھی۔ ایک شہر سے سَو خط چلے، اور فرض کرلو انھیں دس شہروں میں جانا ہے، بس دس تھیلے الگ شہروں کے لیے بنائے اور انھیں اُن شہروں کو جانے والی گاڑیوں میں رکھ دیا۔ ختم ہوگئی چھٹائی کی پہلی منزل۔

لیکن اب ذرا آج کا حال دیکھو کہ لگ بھگ ۱،۱۲،۰۰۰ ڈاکخانوں سے ملک میں ہر شہر اور ہر گاؤں کے لیے ایک کروڑ سے بھی زیادہ خط نکل رہے ہیں۔ اب کیا ہو۔؟ اب اگر انھیں ذرا بھی غلط طرح چھانٹا جائے تو شاید خط کو اپنی آخری منزل پر پہنچنے میں مہینوں لگ جائیں۔ اِن کو الگ الگ ریلوں میں سفر کرنا ہے، کچھ کو ہوائی جہاز پر جانا ہے، کچھ کو ایسے اسٹیشنوں پر رکنا ہے جہاں سے انھیں دوسری ریل میں سوار کیا جائے گا، کچھ کو ایسے اسٹیشنوں پر بھی اُترنا ہے جہاں یہ گاڑی جس سے یہ جارہے ہیں، رکتی ہی نہیں۔ دیکھا تم نے یہ کتنا بڑا جھمیلا ہے! بس میں کہتا ہوں کہ یہ انسان کا ہی دماغ ہے کہ وہ اِس الجھن کو سلجھا لیتا ہے اور ہر دس خطوں میں

سے سات خطوں کو زیادہ سے زیادہ چوتھے دِن اِن کی صحیح منزل پر پہنچا دیتا ہے۔

شاید اِس کا سب سے آسان طریقہ یہ ہوگا کہ تم میرے ساتھ ہو لو، اور دیکھو کہ میں کہاں کہاں سے گزرتا ہوں۔ چلو پہلے بمبئی سے چلتے ہیں۔ تمہارے کسی دوست نے بمبئی سے ایک خط لکھا اور اُسے قریب کے لیٹر بکس میں ڈال دیا ۔ ڈاکخانے کا ایک آدمی سارے خطوں کو ایک تھیلے میں بھر کر قریب کے ڈاک خانے لے گیا، اور لوگوں نے تمام خطوں کے ساتھ اُس خط پر مہر لگادی۔ اِس مہر کے بھی دو فائدے ہیں۔ ایک بات تو یہ کہ جس ٹکٹ پر مہر لگ جاتی ہے اُسے دوبارہ استعمال نہیں کیا جاسکتا، اور دوسرا فائدہ یہ کہ خط چلنے کی تاریخ کا پتہ چل جاتا ہے۔ اسی ڈاکخانے میں یہ خط دو تھیلوں میں بھر دیے گئے۔ ایک قسم کے وہ تھیلے ہوتے ہیں جن میں صرف ہوائی جہاز سے جانے والے خط ہوتے ہیں اور دوسرے وہ جن میں ریل سے جانے والے۔ اچھا چلو، چونکہ ہوائی جہاز تیز سفر کرتا ہے اس لیے اسی سے چلیں۔

تم جانتے ہی ہو کہ ہوائی جہاز تو ہندستان کے صرف بڑے بڑے شہروں میں جاتے ہیں۔ اس لیے اِن خطوں کی چھٹائی بھی آسان ہوتی ہے۔ ڈاکخانے میں ہی انھیں چھانٹ کر الگ الگ شہروں کے تھیلوں میں بند کر دیا گیا۔ اب ہوائی جہاز کے ذریعے یہ سارے تھیلے ناگپور پہنچے۔ یہاں یہ بھی خیال رکھنا کہ اِن تھیلوں میں صرف اُسی خاص شہر کے خط نہیں ہوتے جس کا نام تھیلے پر لکھا ہوتا ہے، بلکہ ان کے آس پاس کے شہروں کے خط بھی اسی میں رکھ دیے جاتے ہیں اور یہاں سے اِن کا باقی سفر ریل میں ہوتا ہے۔ اصل میں ناگپور ہندستان کے ٹھیک بیچوں بیچ میں ہے نا، اسی لیے اس جگہ کو مقرر کیا گیا ہے۔ یہاں سے ہر طرف کو جانے والے جہاز اِن تھیلوں کو اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ اب تم سمجھ لو کہ بمبئی سے آسام میں گوہاٹی جانے والا خط ہوائی جہاز سے سیدھا گوہاٹی نہیں چلا جاتا، بلکہ پہلے یہ ناگپور پہنچتا ہے، پھر گوہاٹی جاتا ہے۔ اس بات کو کہنے کی کیا ضرورت ہے کہ ہوائی

جہاز سے خط بہت جلدی پہنچ جاتے ہیں۔ ہاں یہ بات ضرور بتانے لایق ہے کہ تمھارے آزاد ملک کے ڈاک تار محکمے کے سب سے پہلے وزیر رفیع احمد قدوائی مرحوم نے یہ طریقہ ۱۹۴۹ء میں شروع کیا۔ بس اِس تیزی کا اندازہ تم اِس سے لگا سکتے ہو کہ اس سے پہلے سری نگر سے کیرالہ کے ترِیوا ندرم شہر میں ایک خط کو پہنچنے میں ۱۶۹ گھنٹے یعنی تقریباً سات دن اور سات راتیں لگتی تھیں اور اب صرف ۲۰ گھنٹے میں یعنی ایک دن اور ایک رات سے بھی کم وقت میں پہنچ جاتا ہے۔

یہ تو خیر ٹھیک ہے کہ ہوائی جہاز سے سفر کرنے میں بہت کم وقت خرچ ہوتا ہے لیکن یہ بات بھی تم جانتے ہو کہ ہوائی جہاز ہر جگہ تو جاتے نہیں۔ اِس لیے تمھارے ملک میں میرا زیادہ سفر اب بھی ریل سے ہی ہوتا ہے اور پھر ریل کا سفر بھی دلچسپ ہے، آؤ وہ بھی دیکھیں۔ اِس میں تمھیں میری چھنٹائی کا کام دیکھنے کا اور اچھا موقع ملے گا۔ اچھا چلو ایک بار بمبئی سے پھر چلتے ہیں۔

بمبئی سے ریل سے جانے والے خطوں کو تھیلوں میں بھر کر اسٹیشن پہنچا دیا گیا۔ دیکھو یہاں یہ ایک بڑا سا دفتر ہے جس میں ہر طرف ڈاک تھیلے بھرے پڑے ہیں، اور وہ دیکھو، پلیٹ فارم پر پنجاب میل کھڑا ہے۔ پنجاب میل بمبئی سے چل کر بھوپال، جھانسی، دلی ہوتا ہوا پنجاب چلا جاتا ہے۔ اِس میں یہ لال سا بہت بڑا ڈبہ ڈاک کے لیے ہے۔ مگر یہ کیا، یہاں بیٹھنے کی کوئی سیٹ تو ہے نہیں! ہاں، اِس میں میں سفر کرتا ہوں، یا مجھے راستہ بتانے والے سفر کرتے ہیں۔ یہ دیکھو تھیلے کھولے جا رہے ہیں، مگر ذرا اِس ڈبے کے اندر کی دیواروں کو تو دیکھو! اِن میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں خانے کیسے بنے ہیں۔ جیسے کبوتروں کی کابکیں! ہر خانے پر ایک شہر کا نام بھی لکھا ہے۔ بس اب لوگوں کا کام یہ ہے کہ جیسے ہی کوئی تھیلا کھولا جائے یہ ہر خط کو اُس شہر والے خانے میں رکھ دیں۔

اب بھوپال آنے والا ہے۔ اِن لوگوں نے بھوپال کے سارے خط ایک تھیلے میں جمع کر دیے، مگر یہ لوگ صرف بھوپال کے خطوں کو ہی اِس اسٹیشن پر نہیں

اتاریں گے بلکہ وہ تمام خط یہاں اتار دیے جائیں گے جو بھوپال سے کسی اور گاڑی میں کسی اور طرف کو جائیں گے۔ اور یہ دیکھو، اِس گاڑی میں ایک لیٹر بکس بھی لگا ہوا ہے۔ کوئی چاہے تو اپنا خط اِس میں ڈال دے۔ وہ چاہے کہیں کا بھی ہو یہاں سے اُسی طرف بھیج دیا جائے گا۔ یہ لوگ چلتی گاڑی سے کسی اسٹیشن پر وہاں کے تھیلے پھینک بھی سکتے ہیں اور وہاں رکھے ہوئے تھیلے اٹھا بھی سکتے ہیں۔

اصل میں ایک اصول انسان کی سمجھ میں یہ آیا کہ خط اگر چلتا رہے تو جلدی پہنچے گا۔ ہو سکتا ہے کہ کہیں تھوڑی دور اسے الٹی طرف بھی چلنا پڑے۔ اِس پورے طریقے کو "ریلوے میل سروس" کہتے ہیں۔ یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ وہی 'میل' جسے عام طور پر تیز چلنے والی ریل گاڑی سمجھا جاتا ہے، اصل میں اُس کے معنی "ڈاک" کے ہوتے ہیں۔ اب تم نے دیکھا کہ اگر ہوائی جہاز کی تیزی اور ریل کے سفر کو ملا دیا جائے تو خط کی رفتار کتنی تیز ہو جاتی ہے۔ مگر آج تم نے میرے سفر کے لیے اتنا اچھا ڈبہ دیکھ لیا تو تم سمجھ رہے ہو گے کہ میں نے ریل میں ہمیشہ ہی اتنے آرام سے سفر کیا ہے۔ اب سے کوئی ستر اسی سال پہلے ہی کی تو بات ہے کہ نہ پنکھے تھے۔ نہ یہ اتنی اچھی روشنی۔ چھوٹا سا ڈبہ جس میں تیل کی لالٹینیں جلتی تھیں، اُن کا دھواں گھٹتا تھا، اُسی میں مجھے راستہ بتانے والے لوگ بڑی مشکل سے اپنا کام کرتے تھے مگر کرتے ضرور تھے۔

شروع میں ہر ڈاکخانے میں ہی الگ الگ اسٹیشنوں کے خط چھانٹے جاتے تھے۔ ایک تھیلا ہر اسٹیشن کا الگ ہوتا تھا اور اُسے اُس طرف جانے والی گاڑی کے گارڈ کے ڈبے میں رکھ دیا جاتا تھا۔ بات یہ تھی کہ ریلیں بھی سب جگہ نہیں جاتی تھیں۔ اور ڈاک بھی تھوڑی ہوتی تھی، اِس لیے کام چل جاتا تھا۔ مگر جب یہ دونوں چیزیں بڑھیں تو مشکلیں بھی بڑھیں، اور یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ چھٹائی کا کام ریل کے اندر ہی کیا جائے۔ چونکہ اِس میں وقت بچتا ہے۔ چنانچہ ۱۸۶۳ء میں ایک دوڑتا ڈاکخانہ کانپور اور الہ آباد کے بیچ ریل میں کھولا گیا۔ جب یہ تجربہ کامیاب ہو گیا تو اِس کام کو

اور آگے بڑھایا گیا۔ پھر ۱۹۳۰ء میں تیز رفتار گاڑیاں 'میل' بھی چلائی گئیں۔ انھیں آج تک بھی کچھ لوگ ڈاک گاڑی ہی کہتے ہیں۔

پتے کی پریشانیاں

ایک مشکل تو تم نے دیکھ لی اور اس کا علاج بھی سُن لیا۔ اب ایک مشکل میں تمھیں اور بتاؤں۔ یہ پریشانی ہے پتے کی۔ ہاں ہاں، یہی پتہ جو تم اپنے خط کے ایک طرف لکھتے ہو۔ بس تم یوں سمجھ لو کہ میرے کہیں پہنچنے میں اس سے بڑی کوئی چیز نہیں ہے۔ مگر تم کہوگے کہ پتہ تو ہر خط پر لکھا ہی جاتا ہے! مگر بھائی، صرف لکھنا ہی شرط نہیں ہے۔ اس کا صحیح لکھنا اور اس طرح لکھنا کہ اسے آسانی سے پڑھا بھی جا سکے، یہ بات سب سے زیادہ ضروری ہے۔ اب اس میں ایک بات تو یہ ہوئی کہ پتہ صحیح طرح اور صاف صاف لکھا جانے اور دوسری ایک اور مشکل ہے زبان کی۔ تم خود دیکھ لو کہ تمھارے ہی ملک میں کتنی زبانیں لکھی اور پڑھی جاتی ہیں۔ اب تم نے اردو میں پتہ لکھا تو مدراس والے تو اُسے نہیں پڑھ سکتے، اور اسی طرح کسی نے تامل میں پتہ لکھا تو اُسے کشمیری کیسے پڑھے؟ اب آئی یہ مشکل تمھاری سمجھ میں!

پھر تمھارے بہت سے بزرگ پتے میں بھی بہت سے القاب، آداب وغیرہ اور نہ معلوم کیا کیا کچھ لکھتے تھے۔ ذرا تصویر نمبر ۶ اور ۷ پر خط دیکھو۔ اس لفافے پر جو کچھ لکھا ہوا ہے۔ ذرا اُسے پڑھنے کی کوشش کرو۔ لو میں سناؤں تمھیں آج کے انداز میں کچھ اس طرح لکھا ہے۔

"انشاء اللہ تعالیٰ لفافہ ہذا بہ لکھنؤ بمکان مجتہد عصر والزماں جناب سید محمد صاحب دام ظلہم رسیدہ بمطالعہ مولوی صاحب مشفق، مکرم مظہر... وکرم مولوی محمد سیادت دام لطفہ، در آید۔ محصول ڈاک خط ہذا بالکل در امر وہہ دادہ شد، خط جواب طلب"

پھر آگے لکھا ہے :۔ "...... مولوی محمد سیادت صاحب روانہ شدہ ....
خط ہذا بملاحظہ مولانا سید محمد دام فضلہ بگذرد۔"
دوسری طرف مہر اور خط کی قیمت کے علاوہ لکھا ہے :۔
"راقم سید امام علی متوطن امروہہ مرقومہ یازدہم (۱۱)
شہر جمادی الاول سنہ ۱۲۴۶ ہجری"
(یہ خیال رکھنا کہ یہ خط ڈاک کے ٹکٹ چلنے سے بہت پہلے کا ہے۔)
اگر تم پہلے کے لوگوں کے لکھے ہوئے پتے پڑھو تو تم کہوگے کہ اس کا تو سر



تصویر نمبر ۱۲

ایک پرانا خط۔

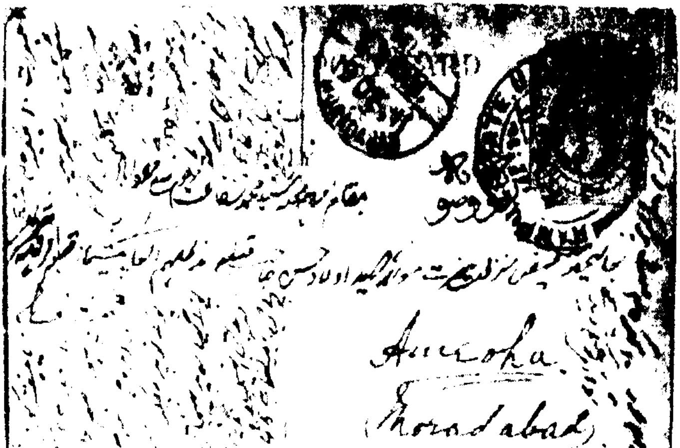
کارڈ ہذا بمقام امروہہ محلہ شفاعت پوتہ رسیدہ باس سید عظمت حسین ولد سید مقبول حسین صاحب
کے پہنچ کر مسماۃ سفینہ خاتون و امینہ خاتون زوجگان مولوی اولاد حسن صاحب کے پہنچے۔

(بشکریہ مولوی سید محمد عبادت صاحب۔ امروہہ)

پیر ہی نہیں ہے ۔ نام محلے میں گھس گیا ہے، محلہ صوبے کے اندر ہے اور صوبے کے بعد کہیں گلی کا نمبر ہے پھر شہر ہے اور بیچ میں القاب اور آداب بھی ہیں۔ تمہارے ملک کے بہت پُرانے خطوں میں سے تمھیں دو دلچسپ مثالیں اور سناؤں تو تم شاید ہنسوگے۔ تصویر نمبر ۱۴ پر خط کے پتے کو پڑھو۔

"کارڈ ہذا بمقام امروہہ محلہ شفاعت پوتہ رسیدہ پاس سید عطرت
حسین ولد سید مقبول حسین صاحب کے پہنچ کر مسماۃ سفینہ خاتون دامنہ
خاتون زوجہ گان مولوی اولاد حسن صاحب کے پہنچے "

ذرا پہلی بار پڑھ کر بتاتا کہ یہ خط اصل میں کس کو ملنا چاہیے۔ ؟ یہ تو تھی ایک مثال اور دوسری بھی سن لو۔ اس میں شاید تمھیں زیادہ مزہ آئے گا۔



تصویر نمبر ۱۵۔

ایک پُرانا خط جس میں پتہ خط کے مضمون میں گھس گیا ہے۔

(بہ شکریہ مولوی سید محمد عبادت صاحب۔ امروہہ)

"انشاء اللہ تعالیٰ العزیز لفافہ ہذا کلکتے پہنچ کر کولا ٹولا کے نزدیک سراج الدین اور اللہ داد خاں تاجران کی آڑتھ پر نورچشمی، راحت جان، سعادت اطوار فرزند دلپذیر میاں شیخ عنایت علی طولعرہ، کو ملے۔ دس رمضان المبارک ۱۲۶۶ھ ہجرت رسول کو خطِ ہذا تحریر کیا گیا اور' بیرنگ' سپردِ ڈاک کیا گیا۔

اب تم پر لازم آتا ہے کہ بغیر ایک لمحہ ضائع کیے اِس خط کو پیسے دے کر چھڑاؤ اور فوراً پڑھو۔ اور اِس کو پڑھتے ہی اپنے اوپر آب و دانہ حرام سمجھو تا وقتیکہ تم جونپور نہ پہنچ جاؤ۔ اور اِسے اپنے بیے حکم آخر قرار دو۔" دیکھا۔ تم کہوگے کہ یہ پتہ ہے یا خود خط ہے۔! ہاں بھائی، پہلے کچھ لوگ ایسا بھی کرتے تھے۔ پھر ایک پریشانی یہ بھی تھی کہ آج کے مقابلے میں خط یا لفافے بڑے چھوٹے ہوتے تھے۔ پھر اِس لفافے پر پتے کے علاوہ اُس زمانے کے ڈاک لیبل بھی چپکانے ہوتے تھے۔ اِس لیے اتنے لمبے لمبے پتے لکھنے میں بہت دقت ہوتی تھی۔ بعد میں چھپے چھپائے ٹکٹ والے لفافے چلے تب بھی اِن کی لمبائی چوڑائی بہت کم ہوتی تھی۔ اب ذرا تصویر نمبر۱۱ پر ایک لفافے کی تصویر دیکھو اور پورا پتہ پڑھو۔ لکھا ہے:-

"بفضلہ تعالیٰ بمقام قصبہ پنڈراول ضلع بلند شہر تحصیل خورجہ بخدمت کنور صاحب مشفق مہربانِ دوستان کنور محمد رضا خانصاحب و کنور علی رضا خاں صاحب راقم سید شاہ ابوالحسن از اسمٰعیل پور ضلع انبار تحصیل زائن گڈھ پرگنہ سادھوڑہ مورخہ ۲۵ جنوری ۱۸۸۰ء بصیغہ پیڈ جواب عریضہ مرحمت ہو۔"

اور ساتھ ہی تصویر نمبر۱۲ پر اِس پوسٹ کارڈ کی درگت بھی دیکھ لو۔ اِسے رجسٹرڈ کرنے کے لیے کارڈ پر چھپے ہوئے ٹکٹ کے علاوہ بارہ ٹکٹ اور ایک چٹ رجسٹرڈ کی چپکائی گئی ہے۔ شاباش ہے ان چھانٹنے والوں کو اور ان ڈاکیوں کو جنھوں نے اِس خط کو اپنی منزل تک پہنچایا۔

سلہ ملک راج آنند کی انگریزی کتاب ہندستانی ڈاکخانے کی کہانی (STORY OF INDIAN POST OFFICES) سے ترجمہ کیا گیا۔

اب ایسے خطوں کو چھانٹنے میں کتنی پریشانی ہوتی ہوگی۔ اس کے لیے ڈاکخانے والے ہر طرح سے لوگوں کو سمجھاتے رہے ہیں۔ آسانیوں کے لیے نئے نئے طریقے ایجاد کیے ہیں۔ جیسے فورٹ بمبئی نمبر۱" یا "چاندنی چوک دلی نمبر۶" وغیرہ وغیرہ۔ یہ بڑے شہروں میں علاقے کے نمبر ہیں۔ تم بھی کوشش کرو کہ آسانی کے لیے اور خط کو جلدی سے جلدی اپنی منزل پر پہنچانے میں مدد کے خیال سے صحیح پتہ لکھنا سیکھ لو۔ ممکن ہے کہ تم یہ بات جان کر حیران ہو کہ ڈاکخانے والے آج بھی یہ شکایت کرتے ہیں کہ ہر دس میں سے کم سے کم تین خط ایسے ہوتے ہیں جن میں پتہ لکھنے والے صاحب سڑک کا نام، محلّے کا نام یا ضلع لکھنا بھول جاتے ہیں۔ دیکھیں تم اپنے خطوں میں صحیح پتہ لکھنے کا کتنا خیال رکھتے ہو۔

مگر میں نے تمھیں ایک پریشانی زبان کی بھی بتلائی تھی۔ ہر شخص ہندستان کی ساری زبانیں تو نہیں جان سکتا۔ کسی نے تامل میں پتہ لکھا تو وہ چھانٹنے والا جو بنگالی جانتا ہے اِسے کیسے پڑھے؟ اب اُس ریل کے ڈبے میں، جہاں خط چھانٹے جا رہے تھے کیسے کام چلے؟ مگر ابھی کچھ دن ہوئے ڈاکخانے والوں نے ایک ایسا طریقہ نکالا ہے کہ اگر اس کو سب لوگ استعمال کرنے لگیں تو خط پہنچنے میں کوئی مشکل ہی نہیں ہوگی۔

اس طریقے میں پتے کے بعد چھ ہندسوں کا ایک عدد لکھا جاتا ہے۔ جیسے نام مکان نمبر، محلّے وغیرہ کے بعد لکھا جائے، "چاندنی چوک۔ دلی" اور اس کے بعد "۱۱۰۰۰۶" اصل میں ڈاکخانے والوں نے کیا یہ ہے کہ پہلے سارے ہندستان کو آٹھ حصّوں میں بانٹ دیا ہے۔ جیسے شمالی حصّے یعنی کشمیر، پنجاب ہریانہ اور دہلی کو نمبر۱ کہا۔ اس کے بعد دوسرا ہندسہ صوبے یا پہلے حصّے کے کسی چھوٹے حصّے کے لیے رکھا گیا ہے۔ پھر تیسرا ہندسہ صوبے میں ضلعے کے لیے ہے اور باقی تین ہندسے کسی شہر کے ڈاکخانوں کے علاقوں کے نمبر ہیں۔ جب لوگ اس طریقے کو پوری طرح سمجھ لیں گے اور اپنے پتے کے ساتھ اسے لکھنا شروع کر دیں گے تو خط چھانٹنے میں کوئی پریشانی نہیں

رہے گی۔ بس یوں سمجھ لو کہ آخری تین ہندسے پڑھنے کے بعد ڈاکخانے تک کا پتہ چل جائے گا۔ اب تم بھی ایسا کرو کہ اپنے قریب کے ڈاکخانے سے اپنے ڈاکخانے کا پورا نمبر معلوم کر لو اور اپنے خط میں پتے کے ساتھ اِسے لکھنے کی عادت ڈال لو۔ اس کا انگریزی میں چھوٹا سا نام "پن کوڈ" (P.I.N. CODE) ہے۔

خطوں کا قبرستان

تم بہت حیران ہو، خطوں کے قبرستان سے! ہاں بھائی! میں نے کچھ بہت زیادہ غلط تو نہیں کہا۔ میرا ایک ایسا گھر بھی ہے جہاں میں صرف اُس وقت بھیجا جاتا ہوں جب میرا لینے والا کوئی نہیں ہوتا۔ انگریزی میں اسے " ڈیڈ لیٹر آفس " کہتے ہیں۔ تمھارا جی چاہے تو اِسے 'خطوں کا قبرستان' کہہ لو۔

یہ تو میں تمھیں کئی بار بتا چکا ہوں کہ خط کا پہلا مقصد ہے اس شخص کے پاس جلدی سے جلدی پہنچ جانا جس کو یہ لکھا گیا ہے۔ اچھا اب اگر وہ شخص نہ ملے جس کے نام یہ خط بھیجا گیا ہے، بلکہ اُس شخص کا گھر یا پتہ کچھ بھی نہ ملے، تب؟ اُس وقت یہ خط کہاں جائے گا؟ ڈاکخانے والوں نے ایک بات یہ بھی طے کر لی ہے کہ اگر وہ شخص جس کے نام خط لکھا گیا ہے، نہ مل سکے، یا وہ اُس پتے پر رہتا ہی نہ ہو، تو یہ لوگ اس خط کو اس کے بھیجنے والے کے پاس لوٹا دیتے ہیں۔ مگر کچھ لوگ اپنے خط میں اپنا پتہ بالکل بھی نہیں لکھتے۔ ایسی حالت میں یہ خط کہاں جائے؟ بس اُس وقت اِس غریب خط کو 'خطوں کے قبرستان' میں بھیج دیا جاتا ہے۔ وہاں کے لوگ بھی اِسے دیکھتے ہی ضائع نہیں کر دیتے۔ اگر یہ پوسٹ کارڈ ہو تو اسے پورا پڑھتے ہیں۔ شاید کہیں خط کے مضمون میں بھیجنے والے کا نام پتہ مل جائے۔ اِن لوگوں کو بند خطوں کو کھولنے کی بھی اجازت ہوتی ہے۔ اگر انھیں پتہ مل جاتا ہے تو یہ اِس خط کو بھیجنے والے کو واپس لوٹا دیتے ہیں۔ لیکن اگر پتہ نہ ملے تو مجبور ہو کر یہ اِسے ضائع کر دیتے ہیں۔

'خطوں کا قبرستان' بھی سمجھ لو بس اتنا ہی پرانا ہے جتنا خود عام آدمی کا خط۔ بلکہ ایک طرح سے اس کی ضرورت پہلے جتنی تھی، آج نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ آج کل تو سستا خط ہے، بھیجنے والا خود اُس کی قیمت دے چکا ہوتا ہے۔ مگر پہلے وہ شخص پیسے ادا کرتا تھا جو خط ڈاکیے سے لے رہا ہو۔ اُس وقت خط لینے والا یہ دیکھ کر کہ اسے بہت سے پیسے ادا کرنے ہوں گے، خط لینے سے انکار بھی کر سکتا تھا۔ اب ڈاکخانے والے اُسے ڈھونڈتے تھے جس نے یہ خط بھیجا ہے۔ اور پھر جب وہ بھی نہ ملتا تھا تو اس خط کو جلا دیتے تھے۔ اسی لیے اُس زمانے میں لاوارث خط بہت ہوتے تھے۔ تم نے ابھی تھوڑی دیر پہلے کچھ بڑے دلچسپ پتے سنے تھے۔ اس میں اگر تم اس خط کے پتے کو ذرا غور سے پڑھو جو "نورچشمی راحت جان..... میاں شیخ عنایت علی طول عمرہ،" کو بھیجا گیا ہے تو تمھیں ایک اور دلچسپ بات بھی ملے گی۔ خط لکھنے والے صاحب نے اپنے بیٹے کو خوب زور دے کر یہ بات پتے کے ساتھ ہی لکھ دی ہے کہ وہ فوراً جونپور چلے جائیں۔ اب اگر میاں عنایت علی چاہتے تو صرف پتہ پڑھ کر ہی خط یہ کہہ کر واپس کر سکتے تھے کہ "نہیں صاحب، یہ خط میرا نہیں ہے۔" اور پہلے کچھ لوگ ایسا غلط کام بھی کرتے تھے۔

اسی لیے 'خطوں کے قبرستان' کا دفتر ہندستان میں ۱۸۵۸ء سے بھی پہلے قائم کر دیا گیا تھا، اور آج بھی ہندستان کے بہت سے علاقوں میں یہ قبرستان موجود ہے، جس میں بہت سی زبانیں پڑھنے والے لوگ ملازم رکھے جاتے ہیں۔ اس قبرستان میں ہر روز لگ بھگ ستر ہزار خط پہنچ جاتے ہیں جن میں سے صرف سات ہزار خط سچ مچ ایسے ہوتے ہیں جن کے بھیجنے والے کا پتہ مل پاتا ہے نہ اُس شخص کا جسے وہ بھیجا گیا ہے۔ باقی خطوں کو کسی نہ کسی طرح اُن کی منزل پر پہنچا دیا جاتا ہے یا پھر بھیجنے والے کو لوٹا دیا جاتا ہے۔

اب تم بھی جب کبھی خط لکھو تو اس بات کا خیال رکھنا کہ تمھارا خط 'اس قبرستان' میں نہ چلا جائے۔ اس کے لیے پہلی بات تو یہی ہے کہ جسے خط لکھ رہے

ہو۔ اُس کا پتہ بالکل ٹھیک ٹھیک اور صاف صاف لکھو اور پھر یہ بات بھی یاد رکھو کہ اگر ہو سکے تو اپنے خط پر باہر ہی، ورنہ اندر تو اپنا پورا پتہ ضرور ہی لکھ دو۔ اس سے سب کو آسانی ہو گی۔

آزادی کے بعد

اچھا بھائی، ایک طرح سے میں ہزاروں سال کا سفر کرنے کے بعد اب اس زمانے میں پہنچ گیا ہوں جس میں تم رہتے ہو، اور میں نے تمھیں اپنے متعلق بہت کچھ بتا بھی دیا ہے۔ مگر تمھیں ایک بار پھر تھوڑا سا پیچھے لے کر چلتا ہوں۔ گھبراؤ نہیں، اب کی بار دو چار ہزار سال پیچھے نہیں جانا پڑے گا۔ اب کی بار تم صرف پچیس سال پیچھے جاؤ گے۔ میرا مطلب ہے ہم یہ دیکھیں گے کہ آزادی ملنے کے بعد سے اب تک تم نے کتنی ترقی کی ہے۔

۱۸۵۴ء سے ۱۹۴۷ء تک کے ترانوے سال میں بھی میں نے ترقی ضرور کی، مگر ایسی نہیں جیسی اِن پچیس سالوں میں کی ہے۔ تم نے سنا ہی تھا کہ ۱۸۵۴ء میں تمھارے پورے ملک میں سب ملا کر سات سو ڈاکخانے تھے اور کوئی پچیس لاکھ خط سال بھر میں تمھارے ملک میں گھومتے تھے۔ جس سال تمھیں آزادی ملی ہے اُس سال تمھارے ملک میں ۲۲,۱۱۶ ڈاک خانے کھل چکے تھے جن میں سال بھر میں ایک ارب چھبیس کروڑ (۱,۲۶,۰۰,۰۰,۰۰۰) خط آتے تھے مگر اس کے صرف پچیس سال بعد یعنی ۱۹۷۲ء میں تمھارے ملک میں کل ۱,۱۲,۰۰۰ ڈاک خانے ہو گئے۔ جس کا مطلب ہوا کہ صرف پچیس سال میں اِن کی تعداد پانچ گنے سے بھی زیادہ ہو گئی۔ اِسی طرح اب سب مِلا کر کوئی چھ ارب (۶,۰۰,۰۰,۰۰,۰۰۰) خط سال بھر میں ہندستان میں گھومتے ہیں۔ ایک سب سے اچھی بات یہ ہے کہ اب ڈاک خانے صرف شہروں یا بڑے بڑے قصبوں میں ہی نہیں ہیں بلکہ ہندستان کے کل ۶,۰۳,۰۰۰ گاؤں میں سے لگ بھگ ۱,۰۱,۱۶۲ گاؤں میں

بھی ڈاک خانے موجود ہیں۔ اب پورے ملک میں کوئی بھی چھوٹے سے چھوٹا اور اور دور سے دور گاؤں ایسا نہیں ہے جہاں ڈاک پہنچانے کا انتظام ہی نہ ہو بہت سے بڑے شہروں میں کچھ ڈاک خانے عام وقت کے علاوہ رات کو بھی کام کرتے ہیں۔ اِس وقت سب مِلا کر ۱۳۰ ڈاکخانے ایسے موجود ہیں۔ ایک اور بات بھی شروع کی گئی ہے۔ اور وہ ہے "چلتا پھرتا ڈاکخانہ" یہ ڈاک خانہ موٹر پر ہوتا ہے اور بازار میں یا گاؤں کے پاس کہیں کچھ دیر کے لیے رُک جاتا ہے، اور لوگ اپنی ضرورت کا ڈاک کا سامان خرید لیتے ہیں۔ ایسے ۱۰ چلتے پھرتے ڈاکخانے ملک بھر میں کام کرتے ہیں۔ اور جانتے ہو اِس اتنے بڑے کام کو چلانے کے لیے پورے ملک میں کتنے آدمی لگے رہتے ہیں۔؟ جتنا بڑا کام ہے اُس کے لحاظ سے تو بہت زیادہ نہیں ہیں۔ صرف ساڑھے پانچ لاکھ۔

ایک سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اب ڈاکخانے کو حکومت کی آمدنی بڑھانے کے لیے نہیں چلایا جاتا، بلکہ اب اسے جنتا کی خدمت اور اسے زیادہ سے زیادہ آسانیاں پہنچانے کے مقصد سے چلایا جاتا ہے۔ ڈاکخانے والوں کا نعرہ ہے "اپنی خدمت سے پہلے دوسروں کی خدمت" چنانچہ تمھیں یہ جان کر شاید کچھ حیرت ہو کہ یہ پوسٹ کارڈ جو آج تم دس پیسے میں خریدتے ہو اور جب چاہتے ہو اپنے دوستوں کو لکھ دیتے ہو، اِس پر سب مِلا کر دس پیسے سے زیادہ خرچ آتا ہے۔ مگر چونکہ غریب آدمی اور امیر آدمی دونوں کا ہی خیال رکھا جاتا ہے، اِس لیے اِسے بند نہیں کیا گیا۔ بتاؤ اب اگر تمھارے پر دادا یہ سب کچھ دیکھیں تو انھیں کتنی خوشی ہو۔

تو بھائی ایک طرح سے میری کہانی تو ختم ہو گئی۔ بس اب تو ایک آدھ اِدھر اُدھر کی بات تمھیں اس لیے اور بتانا چاہتا ہوں کہ شاید تمھیں اِس میں مزہ آئے۔

ایک دل چسپ مشغلہ

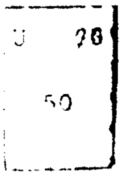
کیا تم کبھی اپنے کسی ایسے دوست سے ملے ہو جسے ٹکٹ جمع کرنے کا شوق ہو؟ وہ ایک ڈاک ٹکٹ کے پیچھے کیسا دیوانہ پھرتا ہے، اور اگر کسی دوسرے ملک کا یا اپنے ہی ملک کا کوئی خاص ٹکٹ اس کے ہاتھ لگ جائے، تب تو بس اُس کی عید ہو جاتی ہے۔ ہاں بھائی ٹکٹ جمع کرنے کا شوق بھی بڑا دلچسپ مشغلہ ہے۔ اِس میں



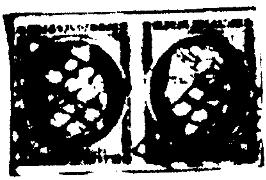
تصویر نمبر۱۶



تصویر نمبر۱۷



تصویر نمبر۱۸



تصویر نمبر۱۹

تصویر نمبر۱۶ سنہ۱۸۴۰ء میں ملکہ وکٹوریہ کا لندن میں پہلا ٹکٹ۔ تصویر نمبر۱۷ نیو کالیڈونیا کا ٹکٹ۔ تصویر نمبر۱۸ یوگنڈا کا ٹائپ کیا ہوا ٹکٹ۔ تصویر نمبر۱۹ فرانس کے دو ٹکٹ جس میں سے ایک میں چہرہ سیدھا اور دوسرے میں الٹا چھپا ہے۔

جس شخص کے پاس جتنا بھی پُرانا ٹکٹ ہوگا اتنی ہی اس کی قدر اور قیمت زیادہ ہوگی۔ پھر بعض بعض ٹکٹ تو کسی خاص موقع پر تھوڑے سے عرصے کے لیے چلائے جاتے ہیں، اُن کی تو بہت مانگ ہوتی ہے۔

ویسے تو تم ہر روز خطوں اور لفافوں پر ٹکٹ دیکھتے ہو۔ آج یہ تمھیں اتنے عجیب نہیں لگتے، چونکہ یہ تمھارے ہاتھوں میں ہر وقت آتے رہتے ہیں۔ لیکن سوچو کہ اب سے کوئی چالیس پچاس سال بعد جب یہ ٹکٹ چلنے بند ہو جائیں گے اور اِن کی جگہ نئے کچھ اور ٹکٹ چل رہے ہوں گے، اُس وقت آج کے ٹکٹ دیکھ کر تمھیں کتنا عجیب عجیب سا لگے گا۔ ممکن ہے تم اپنے چھوٹوں سے کہو "ہاں ہاں، ہم نے یہ ٹکٹ استعمال بھی کیے ہیں۔" بس کچھ اسی قسم کی بات ہوگی لوگوں کے ذہن میں جب پہلی بار انھوں نے ٹکٹ جمع کرنے شروع کیے ہوں گے۔

اور تمھیں یہ جان کر شاید کچھ حیرت ہوگی کہ ٹکٹ جمع کرنے کا مشغلہ بھی لگ بھگ اتنا ہی پُرانا ہے۔ جتنا خود ٹکٹ ہیں۔ یاد ہے سب سے پہلے ٹکٹ کب اور کہاں چلے تھے۔ ۱۸۴۰ء میں لندن میں۔ کہتے ہیں کہ اِسی زمانے میں برطانیہ کے میوزیم میں ایک صاحب جان ایڈورڈ گرے صاحب کام کرتے تھے۔ انھوں نے اُسی وقت سے ٹکٹ جمع کرنے شروع کر دیے۔ ان کے جمع کیے ہوئے ٹکٹوں کا خزانہ اگر سب سے بڑا نہیں تو سب سے پرانا ضرور سمجھا جاتا ہے۔

اور صاحب یہ ٹکٹ جمع کرنے کا شوق کچھ ایسا پھیلا کہ اب تو دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا بڑا شہر ہو جہاں ایک دو بڑے بڑے ٹکٹ جمع کرنے والے نہ ہوں۔ لوگوں نے ٹکٹ جمع کرنے کے شوق پر اور خود ٹکٹوں پر بہت سی کتابیں لکھیں۔ دنیا بھر میں کتنے ہی رسالے صرف نئے پُرانے ٹکٹوں کے بارے میں نکلتے ہیں، اور بعض بعض ٹکٹوں کے بارے میں تو لوگ کچھ ایسی عجیب عجیب باتیں کھوج کر بتلاتے ہیں کہ وہ شاید اِن کے چھاپنے والوں کو بھی معلوم نہ ہوں۔

دیکھوں بلکہ کروڑوں ٹکٹوں کی چھپائی میں کوئی دو چار ٹکٹ ٹیڑھے چھپ

گئے تو لوگوں نے انھیں بھی ڈھونڈ نکالا۔ اگر اُس کی اتنی باریک لکھائی میں کوئی غلطی رہ گئی تو اِن ٹکٹ جمع کرنے والوں کی تیز نظروں نے اِسے بھی نہ چھوڑا۔ کہتے ہیں کہ ہندستان کے بالکل پہلے ٹکٹوں میں ـ جن پر انگلستان کی ملکہ وکٹوریہ کا چہرہ چھپا ہوتا تھا۔ کچھ ٹکٹ ایسے چھپ گئے تھے جن میں چہرہ الٹا چھپ گیا تھا۔ لوگوں نے اِس ٹکٹ کو ڈھونڈ نکالا۔

ایک ٹکٹ کوئی سوا سو سال پہلے فرانس میں چلا تھا۔ اِس کی چھپائی میں بھی دو ٹکٹ ایسے چھپ گئے تھے جن میں ایک پر چہرہ سیدھا تھا اور دوسرے میں الٹا۔ ایک شوقین کو یہ دونوں ٹکٹ اِسی طرح ہاتھ لگ گئے کہ انھیں الگ بھی نہیں کیا گیا تھا۔ اب سوچو اُسے کتنی خوشی ہوئی ہوگی ـ!

آسٹریلیا کے مشرق میں ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے جس کا نام ہے نیو کالیڈونیا۔ یہاں ۱۸۵۳ء میں فرانسیسی فوجوں نے قبضہ کر لیا۔ کوئی پانچ چھ سال بعد فوج کے افسروں کو جب ڈاک کے ٹکٹ چلانے کی ضرورت پیش آئی تو ایک افسر نے اپنے بادشاہ نیپولین سوم کی تصویر بلکہ پورا کا پورا ٹکٹ ایک پتھر پر معمولی پن سے کھود دیا، اور بالکل اُسی طرح، جس طرح تمھاری کتابیں چھپتی ہیں اسے کاغذوں پر چھاپ لیا۔ لیجیے صاحب تیار ہوگئے ٹکٹ۔ ایسے ہی افریقہ کے ایک ملک یُگنڈا میں جب انیسویں صدی کے آخر میں پہلی بار ٹکٹوں کی ضرورت ہوئی تو وہاں ٹائپ رائٹر پر ہی ٹکٹ چھاپ لیے گئے۔ بالکل معمولی سے کاغذ پر چار پانچ چھپے ہوئے لفظوں نے بھی وہی کام دیا جو آج کا خوبصورت سے خوبصورت ٹکٹ دیتا ہے۔

اور لوگوں کے شوق اور کھوج کا یہ حال کہ انھوں نے اِن موتیوں کو بھی ڈھونڈ نکالا، بلکہ اِن کے متعلق ساری معلومات بھی جمع کرلیں۔ اصل میں اِس مشغلے کا اصلی فائدہ بھی یہی ہے کہ اِس کے ذریعے آدمی کو بہت سی نئی نئی باتیں معلوم ہوتی رہتی ہیں۔ تاریخ کی چھوٹی چھوٹی بہت سی ایسی باتیں جو عام طور پر کتابوں میں نہیں مل پاتیں وہ اِس قسم کے کاموں کے لیے معلومات حاصل کرنے کے شوق میں آدمی

جان لیتا ہے۔

اب تم اپنے ہی زمانے میں دیکھو. جب بھی ملک میں کوئی خاص بات ہوتی ہے تو یہاں پھر نئے ٹکٹ چلائے جاتے ہیں۔ اِن کو تم یادگاری ٹکٹ، کہہ سکتے ہو۔ جیسے گاندھی جی کی سَو سالہ سالگرہ پر نئے ٹکٹ چلے، مرزا غالب کی سَو سالہ برسی منائی گئی تو اس پر بھی نئے ٹکٹ چلے۔ ابھی ۱۹۷۲ء میں جرمنی میں جب کھیل کود کے مقابلے ہونے تب بھی نئے ٹکٹ چلائے گئے۔ اِسی طرح ہمارے ملک میں یا دنیا میں جب بھی کوئی خاص بات ہوتی ہے تو اُس کی یادگار کے طور پر ایک ٹکٹ چلایا جاتا ہے۔ یہ بہت خوبصورت ٹکٹ ہوتے ہیں، اور انھیں لوگ بڑے شوق سے جمع کرتے ہیں۔ پھر اِس کے ساتھ ہی یہ بھی کوشش کرتے ہیں کہ جس دن کوئی ٹکٹ پہلی بار چلے اُس پر اسی دن کی مہر لگواکر اپنے پاس رکھ لیں۔

کبھی کبھی ہندستان کے بڑے بڑے شہروں میں لوگوں کے جمع کیے ہوئے ٹکٹوں کی نمائشیں بھی ہوتی ہیں جن میں تم دنیا بھر کے ٹکٹوں کے عجیب عجیب نمونے دیکھ بھی سکتے ہو۔ ہندستان میں اب تو ٹکٹوں کا ایک قومی میوزیم بھی بنا دیا گیا ہے جس میں ہندستان کے ہر زمانے کے اور ہر قسم کے ٹکٹ موجود ہیں۔

خیر بھائی، ٹکٹوں کی دنیا اور اس کی کہانی تو ایک الگ قصہ ہے جو پورا تو اس وقت نہیں سنایا جاسکتا۔ تم خود بھی اچھے اچھے ٹکٹ جمع کرنے کی کوشش کرو، اور دیکھو کہ نئے اور پرانے کتنے عجیب عجیب نمونے تم جمع کر سکتے ہو۔

بس بھائی! یہ تھا میرا سفر یا میری کہانی۔ مگر یہ میری کہانی سے زیادہ تو خود تمھاری اپنی ترقی کی کہانی ہے۔ تمھاری ہمت، محنت اور لگن کی کہانی ____ اگر پتھر کی سلیں اٹھا کر چلنے والے ہمت ہار دیتے تو مٹی کی تختیاں نہ بنتیں۔ پھر اگر موم کے خطا لے جانے والے راستے میں تھک کر بیٹھ جاتے تو پینیا ٹرس یا بھوج پتر پر کیسے خط جاتے؟ اگر پیرس یونیورسٹی کے لوگ عام آدمیوں کا خیال نہ کرتے تو میں کیسے لوگوں کے ہاتھوں میں آتا؟ اگر رالینڈ ہل صاحب کے دل میں عام آدمی

کی پریشانیوں کا خیال نہ آتا، یا انھیں آسانیاں تلاش کر لینے کی دھن اور لگن نہ ہوتی تو غریب آدمی بھلا مجھ تک کیسے پہنچ پاتا؟ بس تم میں لگن تھی، اور میں خدمت کے لیے موجود تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اپنے زمانے میں تم میرے لیے کیا کچھ کر کے دکھاتے ہو۔؟